آگ میں پھول

آگ میں پھول

حمایت علی شاعر

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن
ولی دکنی

Himayat Ali Shair
C.B.45,Al-Falah Society
Shah Faisal Colony, Karachi-75230 Pakistan.
Ph: 92-21-4571322

تازہ ایڈیشن 2007ء
اہتمام اوجِ کمال
کمپوزنگ محمد شہزاد شفیق
قیمت 200 روپے

زیر اهتمام
ماہنامہ دنیائے ادب کراچی
623،6 فلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک، صدر۔ کراچی 74400
Ph: 92-21-8480816 / 0212018365
Cell: 0300-2797271 E-mail: dunyaeadab@yahoo.com

اپنے ابّا جان

سید تراب علی صاحب

کے نام

اُس ابر کو بھی اُڑا لے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا دستِ مہرباں کی طرح

حمایت علی شاعر

فکرِ معاش کھا گئی دل کی ہر اِک اُمنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا حُسن کی بارگاہ میں
حمایت علی شاعر

ترتیب

میں اور میرا فن	حمایت علی شاعر
تاثرات	پروفیسر ممتاز حسین
نقشِ ثانی	حمایت علی شاعر

نظمیں

جنت نگاہ
حسنِ بے نام
پیکرِ خیال
حسرتِ قرب
تری آنکھیں
تصویرِ تمہاری
ترکِ وطلب
تماشا
غمِ رائیگاں
تنہا تنہا
ادھوری کہانی
وہ
تیری باتیں، تیرے خواب
غمِ حاصل

جبرِ عہد
وحشتِ بام و در
کھلونے
چل خسرو گھر اپنے۔۔۔
مژدۂ نو
غمِ فردا
جاوداں
اقبال اور میں
آدمی کی کہانی
ترغیب
تین روپ
یارِ کج ادا

غزلیں

تنہائی میں قریبِ رگِ جاں ترا خیال
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
یہ شہرِ رفیقاں ہے دلِ زار، سنبھل کے
اُس سے ملنے کی آس کیا شاعر
آج اے دل، لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
اب تو ہر شورِ طرب سن کر دہل جاتا ہے دل
کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دم ساز نہیں
وقفِ غم و آلام کیے جاتا ہے مجھ کو
کیا کیا نہ زندگی کے فسانے رقم ہوئے
ایک سی ہے یوں تو کہہ لینے کو ہر اک دل کی بات
مدت سے یونہی شام و سحر جاگ رہے ہیں
رات کٹ جائے کسی طرح تو بس
یوں موت کو حیات کا انعام کر لیا
زخم کو پھول، حقیقت کو گماں کہتے ہیں
دل سے جو ترے غم کے پرستار نہ ہوتے
موت سے اے دل ڈرتے کب ہیں
بجا کہ اپنی دسترس میں لوح بھی، قلم بھی ہے
اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر سب سو گئے
ان کی جو راہ تھی وہ اسی پر چلا کیے
نہ جانے اہلِ نشمین پہ کیا گھڑی آئی
کیوں ہو گئی اے شمع، تری بزمِ سخن چپ
میں جو کچھ سوچتا ہوں اب تمہیں بھی سوچنا ہو گا
اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو

نظمیں

ملامت
زندگی اور پتھر
جشنِ آزادی
فسادات کی ایک رات
شہکار
ایشیا
بھجن
شکستِ خواب
نیا عہد نامہ
کوجے
نیپیر روڈ

مہاجر بستیاں
مزارِ قائد پر
پھر یوم بہار آیا
۸/ جنوری ۵۳ء
دیوانی
سوسائٹی گرل
کافی ہاؤس
اجنبی مہمان
چاندنی سے سویرے تک
کہکشاں
طبقاتی مساوات
رموزِ حیات
منظر و پس منظر
انسان امر ہے
سکوتِ مضطرب
زہر خند
ایک سرکش دماغ تھا۔۔۔نہ رہا
لاشوں کی بستی
دلاسہ
مادرِ وطن کا نوحہ
ایک مصرعہ... ایک نظم
رباعیات
ادھوری غزلیں

میں اور میرا فن

کتابیں تو آئے دن چھپتی رہتی ہیں لیکن اپنی کتاب کو اشاعت کے لیے دیتے وقت جو کچھ مصنف پر گزرتی ہے، وہ کچھ اسی کا کا دل جانتا ہے۔ اس وقت میں کچھ عجیب سی کشمکش سے دوچار ہوں۔ ایک طرف تو یہ ندامت کہ جس بک ڈپو اور جس لائبریری میں یہ کتاب رکھی جائے گی وہیں کہیں میر، غالب، اقبال اور دنیا کی دوسری زبانوں کی کم و بیش اسی مرتبے کی شخصیتوں کا سرمایۂ فکر یک جا ہوگا۔ دوسری طرف یہ احساس کہ جانے اس مجموعۂ اشعار کا کیا حشر ہو، ایک طرف تنقید نگار ہیں دوسری طرف بازار، ناقدین میں سوائے چند کے بیشتر ایسے ہیں جن کی نگاہ نکتہ شناس جب کسی تخلیق کو پرکھنے پر آجاتی ہے تو انہیں کسی الف کی شاعری میں ملٹن اور میر کی روح نظر آنے لگتی ہے اور کسی ب کی افسانہ نگاری کے مقابلے میں چیخوف اور پریم چند اپنی کم مائیگی پر سربہ گریباں دکھائی دیتے ہیں اور جب ان کی فکرِ گردوں مقام اپنی بلندیوں سے کسی خاک نشیں کا جائزہ لینے لگتی ہے تو اپنے عہد کی ابھرتی ہوئی شخصیتیں تو درکنار منفرد شخصیتوں کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتی۔

بازار کا عالم یہ ہے کہ تیسرے درجہ کا ادب تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے لیکن ادبِ عالیہ کا بہترین انتخاب اور عہدِ رواں کی عظیم تخلیقات اپنے قارئینِ کرام کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ انہی حقائق کے پیشِ نظر دل ہمیشہ ڈرتا رہا اور میں خاص طور پر اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے گریز کرتا رہا کہ جو عظیم تخلیق ہے اور نہ بازار کی مانگ کے مطابق کوئی چیز۔۔۔لیکن میرے دوست اور کرمافرما۔۔۔جن کی تعداد یقیناً زیادہ نہیں۔۔۔مُصر رہے کہ میں بھی رسوا سرِ بازار ہو جاؤں۔ روایت بھی کچھ یہی رہی ہے۔ میں نے بھی اس روایت کا پاس کیا اور آج اپنا دامن سمیٹے

چوراہے کے بیچ میں کھڑا ہوں بقول ساحرلدھیانوی ؎

مرے دامنِ چاک میں گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں

میری پوری شاعری اِسی ''گردِ راہِ سفر'' کی آئینہ دار ہے۔ یہ گرد زندگی کے ہر موڑ پر میرے دامن ۔۔۔ میرے تن من سے لپٹی رہی ہے اور سچ پوچھئے تو اِسی گرد سے میری شاعری اُبھری ہے اور شاید کسی روز اسی گرد میں دب کر بھی رہ جائے۔ آج جب اپنی ''گردِ سفر'' کی نمائش کا وقت آ ہی گیا ہے تو میں سوچ رہا ہوں ۔ کیوں نہ کچھ دیر کے لیے اس گرد کو صاف کر کے اپنے خدوخال بھی نمایاں کر دوں۔

میرے آبائی وطن ریاست حیدرآباد دکن میں ایرانی تقویم 'فصلی' رائج تھی ۔ ستمبر ۴۸ء میں ہندوستان کے قبضے کے کچھ عرصے بعد وہاں بھی ''عیسوی'' کا رواج ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء میں میٹرک کا امتحان دے کر میں پاکستان آ گیا تھا اور کامیابی کی اطلاع پا کر وہیں میٹرک کی سند منگوالی۔ اس سند پر میری تاریخ پیدائش ۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء مرقوم تھی ۔ میں نے اسی کو درست سمجھ لیا۔ خاندانی یاداشت (فصلی تقویم کے مطابق) میری عمر ۔۔۔ موجودہ عمر سے تین یا چار سال کم ہے۔ اس لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ آج (کتاب کی اشاعت ۱۹۵۶ء) سے پچیس تیس سال پہلے میں نے اپنے آبائی شہر اورنگ آباد میں زندگی کی پہلی سانس لی تھی۔ اس گھر کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ کچی مٹی کا ایک مکان تھا۔۔۔ لیکن اگر مجھے اس کچی مٹی کے گھر پر ناز ہے تو اس لیے کہ اس کی وساطت سے مجھے اپنے ملک کے ننانوے فی صد انسانوں کی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ۔ ان کے تہذیبی پس منظر اور ان کی ذہنی تربیت کے مختلف خم و پیچ کو پرکھنے والی نگاہ عطا ہوئی۔ مجھے وہ درد نصیب ہوا جو میرے شعور کی روشنی میں چمک کر شعلہ نہ بن سکا تو ایک انگارہ ضرور بن گیا۔ یہ انگارہ جو میرے سینے میں مسلسل دہکتا رہتا ہے، میری تاریخ کی امانت ہے، میری تہذیب کا عطیہ ہے۔ یہی انگارہ کبھی ہوائے زمانہ سے بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لیے مشعل راہ

بن جاتا ہے اور کبھی ۔۔۔ چراغِ سرِ مزار۔ ممکن ہے، میرے احباب اور میرے ناقدین اسے فرار سے تعبیر کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہی 'چراغِ سرِ مزار' میری زندگی کا محور بھی ہے۔ اس کا واقعاتی پس منظر بڑا طویل اور درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے اس لیے میں اس کا ذکر نہیں کروں گا لیکن میرے ذہنی عمل اور میری شاعری میں اس کے ردعمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ میں مختصراً ایک بات کہہ دوں ۔۔۔ یوں سمجھ لیجیے کہ محبتوں کے جتنے سہارے مجھے ملے اسی عمر میں 'چراغِ سرِ مزار' میں ڈھل گئے جب زندگی ایک کھیل ایک شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اس المیے نے تنہائی کا شدید احساس میرے دل میں پیدا کر دیا اور عرصہ دراز تک مجھے اس دنیا سے نفرت رہی ہمارے طبقاتی نظام نے اس نفرت کو اور ہوا دی اور کیا عجب تھا کہ میں 'خودکشی' کر لیتا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے چاقو چھین لیا اور ایک کتاب تھما دی (دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کتاب، کالج میں مجھے کبھی نہیں پڑھائی گئی تھی)

اس گمنام شخص کا نام ہے ۔۔۔ کامریڈ افتخار ۔۔۔ جو میرا دوست بھی ہے اور محسن بھی، افتخار نے میرے ذہنی میلان کا رخ اس طرف موڑ دیا جس طرف وہ خود جا رہا تھا یعنی زندگی کے راستے پر ۔۔۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ راستہ کٹھن ضرور ہے لیکن حسین اتنا ہے کہ ہر انسان کا دل دوسرے انسان کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے۔ دھڑکنوں کی ہم آہنگی کے اس احساس نے میری فکر کو ایک نیا زاویہ عطا کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ انسان فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک 'اجتماع' بھی ہے اور انسان کے ارتقاء کی انتہائی منزل اپنی ذات میں ضم ہونا نہیں، ایک 'اجتماعی انسان' ہو جانا ہے ؎

کلی کی ننھی سی گود میں محوِ خواب ہیں گلستاں ہزاروں
زمیں کے ایک ایک ذرہ میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہزاروں

نہایتِ قطرہ ابرِ باراں، مآلِ خورشید کہکشاں ہے
قدم قدم پر ہے موت لیکن حیات کا کارواں، رواں ہے

سکوتِ موج میں مضطر ہیں سینکڑوں طوفاں
تہِ سکوت کی طغیانیوں کو موت نہیں

میں جس گھرانے میں پلا بڑھا وہ نہ صرف یہ کہ کٹر مذہبی گھرانا ہے بلکہ تعلیمی اعتبار سے بھی بہت پیچھے ہے۔صرف ایک میرے والد ہیں جو کچھ تعلیم حاصل کر سکے اور ان کے زیرِ سایہ مجھے کچھ پڑھ لکھ لینے کا موقع مل گیا۔شاعری، ادب، یا سیاست میرے گھرانے کو کبھی چھو کر بھی نہیں گئی بقول غالب ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

میرے گھرانے میں سپہ گری کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی بھی شامل ہے۔اس کا یہ مفہوم نہیں کہ میں کسی زمیندار یا جاگیردار خاندان کا فرد ہوں۔حیدرآباد (دکن) میں ایک طبقہ ہوتا تھا۔۔ ''انعام دار''۔۔۔اس طبقے کی تاریخ یہ ہے کہ بادشاہِ وقت، کسی بات، کسی کام یا کارنامے سے خوش ہو کر مرحمتِ خسروانہ کے طور پر زمین کے کچھ قطعات عطا کر دیا کرتا تھا اور پھر اِسی متاع کے سہارے نسل در نسل زندگی گزرتی۔نسل کے ساتھ تقسیم در تقسیم سے اگر وہ زمین اتنی باقی نہیں رہتی کہ ایک فرد کے متعلقین کی کفیل ہو سکے تو ان گھروں کے افراد ملازمت کی تلاش میں نکل پڑتے۔۔۔ میرا خاندان اسی قسم کی ملازمت پیشہ انعام داروں کا خاندان ہے۔۔۔ظاہر ہے ایسے خاندان میں علم و ادب سے شغف کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔بہر حال۔۔۔ایک ایسے ہی گھرانے اور ایسے ہی ماحول میں پل بڑھ کر میری عمر نے شعور کے حدود میں قدم رکھا اور مختلف قسم کی علمی، ادبی اور سیاسی ہنگامہ بازیوں سے گزر کر زندگی اس موڑ پر آ گئی جہاں پہنچ کر عمل، سوچ کے تابع ہو جاتا ہے۔

میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ پہلے مضامین اور افسانے لکھے اور بعد میں شاعری شروع کی، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب غیر مقسم ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ مدت سے باہم دست و گریباں رہ کر آخر اس منزل تک آ گئی تھیں کہ ملک کا تقسیم ہو جانا ناگزیر تھا۔ادھر حیدرآباد (دکن) جو اپنی جگہ الگ 'ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر' کیے ہوئے تھا۔سیاسی اعتبار سے ایسے گروہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا جس کی سیاسی بصیرت اپنی مثال آپ تھی۔۔۔خیر، اورنگ آباد، جس کی خاک کو ولی جیسے شاعر کے نقشِ کفِ پا کا شرف حاصل ہے، جہاں کی فضاؤں میں داؤد جیسے شیریں مقال شاعر کے نغمے گونجے اور جس کی مٹی نے سراج کو آج بھی اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔عرصۂ دراز سے ادبی اور علمی اعتبار سے اس قدر محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ اپنی آواز کی بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔بلدہ (حیدرآباد) میں تو ادب اور صحافت کا بڑا شہرہ تھا لیکن اورنگ آباد میں کوئی پریس ہی تھا نہ وہاں سے کوئی رسالہ یا اخبار ہی شائع ہوتا تھا۔انجمن ترقی اردو کے سہارے صرف مولوی عبدالحق نے ایک روایت قائم کر رکھی تھی لیکن جب انجمن کا دفتر بھی اورنگ آباد سے اٹھ گیا تو یہ تاریخی شہر ایک بے مصرف سی یادگار ہو کر رہ گیا۔چلتی پھرتی لاشوں کا ایک کھنڈر

میری شاعری نے اسی کھنڈر میں جنم لیا اور آنکھیں کھول کر جب اپنے اطراف دیکھا تو دور دور تک اندھیرا تھا۔کہیں کہیں کچھ چراغ ٹمٹما رہے تھے۔جن کی لرزتی ہوئی روشنی کبھی کبھی دل کی ڈھارس بندھا دیتی تھی۔اس عالم میں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا تصور خود فریبی سے زیادہ نہ تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ کالج سے نکلے ہوئے بہت سارے احباب جوں ہی عملی زندگی میں داخل ہوئے۔ایک بیوی کے شوہر، چند بچوں کے باپ کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ان کے وہ سارے خواب منتشر ہو گئے جو کبھی نظروں کے آئینہ خانوں میں خود کو سنوارا کرتے تھے۔اس گروپ میں صرف میرے قدم ادب و شعر کے میدان میں جمے رہے اور عمر کا ایک بڑا حصہ اپنی اسی خوش فہمی کی نذر ہو گیا۔

آج جب میں اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لینے بیٹھا ہوں تو محسوسات کا کچھ عجیب عالم ہے۔ بیشتر واقعات ذہن کے پردے پر ابھر آئے ہیں اور زندگی آنسو کے ایک قطرے میں لرزتی ہوئی چمک کی طرح مجھ پر خندہ زن ہے اور میں نگاہیں نیچی کیے سوچ رہا ہوں ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

عمر کے اس مختصر سے دوران میں، میں نے اتنے نشیب و فراز دیکھے، اتنے تلخ، ترش اور شیریں لمحات سے گزرا، اتنی ٹھوکریں کھائیں اور اتنی بار گر گر کر سنبھلا کہ اپنی زندگی پر خود ایک طنز ہو کر ہو گیا اور مسائل کو جانے دیجیے۔ روزگار کا مسئلہ یوں بھی اپنے وطن کا ایک خاص مسئلہ ہے ہی۔ میں بھی اس سے دوچار رہا ہوں۔۔۔ کالج کی زندگی سے لے کر آج تک ہر دور میری زندگی کا ایک دور کشاکش رہا ہے۔ ایک بات سلجھتی ہے تو دوسری اُلجھ جاتی ہے اور سلجھنے اور الجھنے کا یہ لامتناہی سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ کل میں ریڈیو سے متعلق تھا، آج انجمن ترقی اردو سے متعلق ہوں اور کیا عجب ہے کہ کل طلوع ہونے والی صبح ۵۰ء کی طرح پھر مجھے ایک اخبار فروش کے روپ میں دیکھے۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے اپنا سر بلند رکھنے کی خاطر معمولی سے معمولی کام بھی کیا ہے اور اُس آگ کو جو ہمیشہ میرے سینے میں دہکتی رہتی ہے کبھی کسی عنوان بجھنے نہ دیا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ مجھے اپنے طبقے، اپنے کچی مٹی کے مکان اور اپنی اس معمولی سی زندگی پر ناز ہے جس کی وساطت سے مجھے سماج میں زندگی کے جدلیاتی عمل کو سمجھنے کا موقع ملا، مجھے وہ درد نصیب ہوا، جو میرے شعور کی روشنی میں چمک کر شعلہ نہ بن سکا تو ایک انگارہ ضرور بن گیا۔ یہی انگارہ کبھی ہوائے زمانہ سے بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لیے مشعل راہ بن جاتا اور کبھی۔۔۔ چراغِ سرِ مزار

آپ ٹھنڈے دل سے میری شاعری کا مطالعہ کریں گے تو میرے خیال میں آپ اس آتشیں رو کو محسوس کر لیں گے جو میری رگ رگ میں رواں دواں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس

آگ کی حدت کو محسوس طور پر پیش کرنے میں، میں کہاں تک کامیاب رہا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود میری شاعری صرف دماغ کا ناپ تول نہیں ہے۔ اس میں دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔

شاعری میں میرا نقطہ نگاہ کسی غیر معمولی انفرادیت کا حامل نہیں ہے میں شعوری طور پر کسی ایسی جدت کا بھی طرف دار نہیں ہوں جو فنکار کا رشتہ اپنے عہد یا اپنے عہد کی زندگی سے توڑ لے۔ میرے خیال میں جتنی اہمیت روایت کی ہوتی ہے، اتنی ہی اُن اقدار کی بھی ہوتی ہے، جنہیں عصرِ رواں جنم دیتا ہے۔ میرے نزدیک فنکار اپنے عہد کا نمائندہ انہی معنوں میں ہوتا ہے اور ادب اپنے عہد کی تاریخ انہی معنوں میں مرتب کرتا ہے کہ وہ اپنے عصر کے شعور کا ترجمان ہوتا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعور کیا چیز ہے؟

شعور حقیقت کے ادراک سے عبارت ہے اور حقیقت وہ نہیں ہوتی جو ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہوتی ہے جو پیش نظر شے میں در پردہ کہیں کارفرما ہوتی ہے لیکن یہاں بھی یہ مسئلہ بحث طلب رہتا ہے کہ دنیا میں مختلف نقاط نظر کے لوگ آباد ہیں اور اپنے اپنے خیال کے مطابق حقیقت کی تلاش میں ہر ایک اپنی راہ کو مستقیم سمجھتا ہے۔ ہر ایک اپنے زاویۂ نظر کو صحیح قرار دیتا ہے۔ پھر یہ کیسے طے ہو کہ کون اپنی دانست میں صحیح ہے اور کون غلط؟ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ یوں نہیں ہو سکتا۔ ہر رجحان کے پیچھے ایک فلسفہ ہوتا ہے اور ہر فلسفہ اپنے تحفظ کے لیے منطق کا ایک قلعہ بھی تعمیر کر لیتا ہے اور اس قلعہ میں گھر کر دماغ اکثر اٹل حقیقتوں سے بھی انکار کر جاتا ہے اور طول و فرسنگ اطراف و جوانب میں الجھ کر خواہ مخواہ ایک مسئلۂ لاینحل بن جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ حقیقت کی جستجو میں فکر کا رخ تاریخ کی روشنی میں متعین کیا جائے۔

تاریخ ادوار کے واقعاتی تسلسل کا نام نہیں بلکہ معاشرتی ارتقاء کے جدلیاتی تسلسل کا نام ہے۔ جب تک ہم تاریخ کے مادی حقائق کی کسوٹی پر بحث طلب مسائل کو نہیں پرکھیں گے، کھرے

اور کھوٹے کا فرق ظاہر نہیں ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ کام وہی فنکار انجام دے سکتا ہے جو ادب کو دل کا مشغلہ نہیں بلکہ دماغ کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے اور ایسے فنکار کے نزدیک نہ صرف اپنے عہد کی اقدار مقدم ہوتی ہیں بلکہ روایتی اقدار بھی، کیونکہ ہر نوزائدہ قدر ماضی میں اپنا ایک تسلسل رکھتی ہے اور اپنی جگہ آئندہ امکانات کے ایک لامتناہی سلسلے کا نقطۂ آغاز بنی رہتی ہے۔

آج کل ادب میں جب بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے تو ادبِ عالیہ کی بحث چھڑ جاتی ہے اور ایک حلقے سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ ادبِ عالیہ شعوری طور پر ہر قسم کی حد بندی سے آزاد رہا ہے اور اسی میں اس کی ابدیت کا راز پنہاں ہے۔ میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ہر داخلی تحریک کی جڑیں خارج میں پیوست ہوتی ہیں اور خارج کے ساتھ ساتھ عمل کی داخلی نوعیت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ میر صاحب کے یہ اشعار پڑھیے ؎

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

نہ مل میر اب ان امیروں سے تو
ہوئے ہیں غریب ان کی دولت سے ہم

کیا ان افکار کا تعلق خارجی عوامل سے نہیں؟

اب ان افکار کے ساتھ غالب تک سفر کیجیے۔ غالب کہتا ہے ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

غالب جس نتیجے پر پہنچا ہے اس کے پیچھے تاریخ کا بھی ایک سفر ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر غالب کا لہجہ اختیار کر گیا اور غالب کے سوالات ہمارے عہد کے سوالات بن گئے ہیں ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کوہکن گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں، آئینۂ خواب گرانِ شیریں

یہی فکری تسلسل اپنے جدلیاتی عمل سے گزر کر آج فرد کو اس کے طبقاتی کردار کا شعور دیتے ہوئے اسے ایک 'اجتماعی انسان' کا تصور دے رہا ہے۔ 'مجرد انسان' کا روایتی تصور آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری زیرلب گنگنا کر الفاظ کو ایک خاص وزن میں ترتیب دے لینے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ دل و دماغ کے ایک معنوی ربط سے وجود میں آتی ہے اور دل و دماغ کا یہ معنوی ربط اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ ہماری نظر میں اپنا عہد اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ روشن نہ ہو۔

جہاں تک میرے کلام کا تعلق ہے اُسے آسانی سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غمِ جاناں، غمِ دوراں اور غمِ وطن۔۔۔ غمِ جاناں کے زمرے میں جو تخلیقات شامل ہیں ان میں یقیناً میرا ذاتی غم موضوعِ شعر ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ میرا ذاتی غم میرا ''نجی غم'' بن کر نہ رہ جائے بلکہ سماجی زندگی کے رشتے سے یہ موضوع غمِ مشترک کی حیثیت اختیار کر جائے۔ چنانچہ اسے غمِ دوراں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ غمِ وطن یقیناً میرے یہاں غمِ جاناں سے مختلف ہے، اس کا لب و لہجہ مختلف ہے، اس میں تلخی کا وہ احساس مختلف ہے جو غمِ جاناں میں بھی اکثر منہ کا مزہ خراب کر دیتا ہے۔ غمِ وطن میں یہ تلخی نسبتاً شدید ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ (اس میں ہجرت کا غم بھی شامل ہے)

میرے اشعار میں کہیں آپ کو ضبط کا احساس ملے گا اور کہیں ایسا محسوس ہوگا کہ چیخ،

للکار بن گئی ہے۔اسے بادی النظر میں جو بھی کہا جائے مگر اس شاعری کا بھی ایک مقام ہے۔اس کا تاثر وقتی سہی مگر تاریخ کے بین السطور میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو یہی شاعری آئینہ دکھاتی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔۔۔دو باتیں اور۔۔۔

پہلی بات تو یہ کہ جدید ادب میں زبان سے جو بے اعتنائی برتی جا رہی ہے، میں اس کا سخت مخالف ہوں۔ میرے نزدیک زبان بنیادی چیز ہے۔ شاعری کیسے ہی خیالات کی آئینہ دار کیوں نہ ہو، زبان کے آرٹ سے بے نیازانہ گزرنے کی کوشش کرے گی تو ممکن ہے کچھ عرصے کے لیے عام توجہ کا مرکز بن جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا دائرہ اثر ہمہ گیر اور دیرپا نہیں رہے گا، تخلیق کی ابدیت کا راز زبان کے آداب میں پنہاں ہے۔ہمیں مروجہ زبان میں نت نئے الفاظ ضرور شامل کرنا چاہیے، نئے انداز بیان کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے لیکن بے مقصد جدتیت جو کلام کو بے کیف بھی بنا دیتی ہے یقیناً سود مند ثابت نہیں ہوگی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ الفاظ کے دروبست اور خیال کی شیرازہ بندی میں اس رکھ رکھاؤ کا ضرور پابند رہوں جس سے اردو زبان کا مزاج عبارت ہے۔

دوسری بات موضوعات کے انتخاب سے متعلق ہے اور خصوصاً حسن و عشق کے معاملات میں۔۔۔میری شاعری میں کہیں بھی آپ کو اس روایت کی جھلک نظر نہیں آئے گی جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، میں نے زندگی کو ہمیشہ جس روپ میں دیکھا ہے اسی روپ میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔ میرا محبوب وہی ہے جو زندگی میں میرا محبوب ہے۔۔۔ میری طرح گوشت و پوست کا انسان۔۔۔ظاہر ہے کہ اس کے محسوسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہو سکتے۔اگر مجھے اس سے عشق ہے تو اس نے بھی مجھے چاہا ہے۔اگر میں اسے اپنا نہیں سکا، تو میں نے گریباں چاک کر کے دشت نوردی کرنے کی بجائے سماجی حالات میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اگر میں نے اسے پا لیا ہے تو سماجی

زندگی میں اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔۔۔زندگی میں یہی کچھ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ سب مفروضات ہیں۔

اس کتاب میں آپ کو بعض ایسی نظمیں بھی ملیں گی جو بالکل گھریلو ماحول سے متعلق ہیں ان میں آپ کو وہ غم بھی ملے گا جو گرہستی سے علاقہ رکھتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ مسرت مجھ سے خود بخود شعر کہلوا لیتی ہے جو آفس سے گھر آنے کے بعد بیوی کے ہلکے سے تبسم اور بچوں کی پرلطف شرارتوں سے مجھے حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح میں اس غم کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جو ان چہروں پر ہلکی سی افسردگی دیکھ کر اندر ہی اندر دل کو کھائے جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اس رجحان کو ادبی دنیا میں کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ میرے نزدیک تو ان موضوعات کو شعر کا موضوع نہ بنانا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ بہر حال زندگی اور شاعری سے متعلق جو میرے نظریات ہیں وہ میں نے بیان کر دیے۔اب آپ جو چاہیں میرے بارے میں رائے قائم کریں۔

حمایت علی شاعر

ریڈیو پاکستان۔حیدرآباد (سندھ)

(۱۹۵۶ء)

O میری بعض نظمیں، کچھ افسانے اور اخباری کالم مختلف رسائل میں میرے قلمی ناموں سے بھی چھپتے رہے ہیں۔۴۵ سے ۱۹۵۰ء تک ہندوستان میں 'حمایت تراب، نردوش اور ابلیس فردوسی' اور پاکستان کے بعض رسائل و اخبارات میں ۵۵ سے ۱۹۹۳ء تک 'ابن مریم' کے نام سے۔۔۔آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں یا احتیاط پسندی۔۔۔(شاعر)

تاثرات

(ایک مضمون سے اقتباس)

حمایت علی شاعر نے خارجی حقیقت کو داخلی حقیقت میں تبدیل کیا ہے اور حقیقت کو مجاز سے چمکانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام کی یہی خوبی ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کی شاعری اگر ایک طرف اپنی خود نوشت سوانح عمری ہے تو دوسری طرف قومی تاریخ کا آئینہ بھی۔ ان کی آواز میں سکوتِ شب کا زیر و بم اور متلاطم سمندر کا مندو جزر دونوں ہی ہیں۔ وہ قوتِ گریہ اور قوتِ شعلہ دونوں ہی سے واقف ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ نئے ادیبوں کی صف میں انہوں نے بہت جلد ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین

(پہلے ایڈیشن سے ماخوذ)

۱۹۵۵ء

نقشِ ثانی

'آگ میں پھول' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سوچتا تھا کہ اپنے کلام کا دوسرا مجموعہ بھی مرتب کر لوں، چنانچہ 'چاند کی دھوپ' کے نام سے کچھ رسائل میں اس کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا مگر اسے دھوپ کی تمازت کہیے کہ حالات کی سرد مہری۔۔۔ وہ کتاب مرتب نہ ہو سکی پھر زندگی نے معاشی مسائل کا ایسا جال بچھایا کہ میں الجھ کر رہ گیا اور عمر کے بارہ سال (فلم انڈسٹری میں) انہیں الجھنوں کو سلجھاتے گذر گئے۔ ۱۹۷۲ء میں جب ہمارا ملک اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار ہو کر شکستگی کے عالم میں کراہ رہا تھا، وطن کی محبت نے مجھے بھی مجبور کر دیا کہ اپنی 'مٹی کا قرض' ادا کر دوں چنانچہ بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کرنے، ترتیب دینے اور طباعت کے مراحل سے گزرنے تک ۷۴ء آ گیا اور کتاب شائع ہو گئی۔ اس کتاب کو رائٹرز گلڈ نے 'آدم جی ایوارڈ' سے بھی نوازا مگر مجھے یہ احساس مسلسل کچوکے دیتا رہا کہ میں نے عمر کے بارہ سال بے کار ضائع کر دیے۔

یوں تو فلمی دنیا میں بھی مجھے بہترین نغمہ نگاری اور فلمسازی کے بھی مختلف 'ایوارڈز' ملتے رہے اور ایسی شہرت اور عزت بھی حاصل ہو گئی جو معاشرے میں ایک خاص سطح کے ذہن کو مطمئن بھی کر دیتی ہے مگر مجھے یوں محسوس ہوتا رہا گویا میرے اندر ایک خلاء پھیلتا جا رہا ہے۔ میری روح ایک ایسے افلاس کا شکار ہو رہی ہے جو ذہنی طور پر ایک دن مجھے قلاش کر کے رکھ دے گی۔ اس ہولناک اندیشے سے میں اکثر لرز اٹھتا اور سوچتا کہ کسی طرح اس جال سے نکل بھاگوں۔ مگر جس

زمین پر یہ جال بچھا ہوا تھا وہ ایک دلدل سے کم نہ تھی۔ میری ہر کوشش مجھے کچھ اور زمین میں اتار دیتی۔ ایسے عالم میں علم و ادب کے خواب 'طوفان سے ساحل کا نظارہ' کرنے کے مترادف ہوتے اور میں ایک کربناک حسرت کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتا۔

سچ پوچھیے تو عمر کے یہ سنہری سال میں نے ایک ایسے برزخ میں کاٹے جس کے بعد حقیقی ادبی زندگی کی آس ایک موہوم خوش فہمی اور خود فریبی سے زیادہ نہ تھی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، مجھے اس زیاں کا احساس بھی تھا مگر میں یہی سوچ کے خاموش ہو رہتا کہ وقت نے یہ سنگین مذاق صرف میرے ساتھ ہی تو نہیں کیا ہے۔ تاریخ میں میرے جیسے کتنے شاعر و ادیب اپنے حالات سے مجبور ہو کر 'بازار' میں جا بیٹھے۔ چاہے وہ بازار کسی بادشاہ کے 'دربار' میں لگا ہو، یا فلمی دنیا کے مصنوعی 'محل دوملوں' میں۔ بادشاہ کی قصیدہ خوانی سے لے کر فلمی کرداروں کی سراپا نگاری تک ہر بکنے والا حرف، علم و ادب کی توہین نہیں تو اور کیا ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب ہر پیش نظر حقیقت، جھوٹ ہی نہیں بلکہ عامیانہ بھی ہو۔

میں نے تنہائی میں کتنی ہی بار ان 'الفاظ' سے معافی مانگی ہے جنہیں اپنی ضرورت کے لیے اشعار کا روپ دے کر میں نے سخن کے تاجروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس عمل پر شرمندگی کا اظہار، طہارتِ ضمیر کا تقاضہ تھا مگر۔۔۔ کاش اس نظامِ حیات کے ماتھے پر بھی عرقِ انفعال کے کچھ قطرے لرز جاتے جس کی گرفت میں رہ کر ہر دور کا ذہن اس جبر کو بخوشی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آج پچیس برس کے بعد 'آگ میں پھول' کا دوسرا ایڈیشن مرتب کرنے بیٹھا ہوں تو اس دور کا ہر لمحہ آنکھوں میں رقص کرنے لگا ہے۔ احساسات و جذبات کے کتنے ہی نقوش ہیں جو نظموں اور غزلوں کی صورت میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ ہر نقش گویا کتابِ عمر کا ایک باب ہے جو نہ صرف میری ذات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈال رہا ہے بلکہ میرے پیارے وطن کی تاریخ کا بھی آئینہ دکھا رہا ہے اس آئینے میں عکس پسِ عکس کتنے چہرے جھلک رہے ہیں جو اس دور کے

انفرادی اور اجتماعی دکھ سکھ میں کہیں نمایاں تھے تو کہیں پوشیدہ۔۔۔

میں جانتا ہوں کہ یہ لمحے اور یہ چہرے اب وقت کی گرد میں دب چکے ہیں اور ان کا شعری اظہار بھی اب ایسا نہیں رہا کہ لمحۂ موجود کے شعری اسلوب سے مطابقت رکھ سکے مگر ماضی سے گریز بھی اپنی شخصیت کو بے بنیاد کر لینے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ ادب کا تاریخ سے بھی ایک رشتہ ہوتا ہے جو ادب کو نہ صرف اپنے عہد کا ترجمان بناتا ہے بلکہ مستقبل کے مورخ کو ماضی کی زندہ حقیقتوں کا سراغ بھی دیتا ہے۔ ہمارے ادب کے مختلف ادوار میں 'شہر آشوب' اور 'مثنویاں' نہ لکھی جاتیں یا کوئی نظیر اکبر آبادی پیدا نہ ہوتا تو اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال، ظفر علی خاں اور جوش ایسے شاعر بھی تاریخ کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کے قابل نہ ہوتے۔ ہر نگاہ استعاروں کے پیچھے، تاریخ کی سچائیوں کی تلاش میں گم ہو کر محض پرچھائیوں کا طواف کرتی رہ جاتی یا 'عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی' تک سفر کر کے اپنے کلبۂ احزاں میں لوٹ آتی اور ادب کی معرفت تاریخ کو وصال و ہجر کی مفروضہ داستانوں کے سوا کچھ نہ ملتا۔ ہم مختلف ادوار کے مسائل انسانی سے واقف ہو سکتے نہ ان تہذیبی اقدار سے جو معاشرے میں روبہ زوال یا نمو پذیر تھیں۔ ہمیں ان محرکات کی بھی خبر نہ ہوتی جو بتدریج کسی عہد کو بدلنے کا سبب ہوتی ہیں۔ انہیں ادب پاروں کی معرفت، مختلف عہد کے زندہ انسانوں سے ہمارے ملاقات ہو سکی ہے اور ہم ان کے دکھ سکھ کو سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں۔

تاریخ کی مثال ایک ایسے دھارے کی ہے جو سطحی طور پر وقت کے بدلتے ہوئے زاویوں کی نمائندگی تو کر دیتا ہے مگر سطح کے نیچے، ڈھلان اور چڑھائی پر، رفتار کی تیزی اور سست گامی کے آنکھ اوجھل محرکات کی نشان دہی نہیں کر پاتا۔ یہ کام ادب اور فن انجام دیتے ہیں وہ زندہ انسانوں کے عمل اور ردِعمل کے آئینے میں اپنے عہد کی ایسی تصویر دکھاتے ہیں جو تاریخ کے بین السطور کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ادب اسی معنی میں تاریخ کا باطنی رہنما ہے کہ اس کے دامن

میں زندگی کی صداقتیں محفوظ رہتی ہیں۔فرد ہو یا کوئی قوم ان صداقتوں سے روشنی لیے بغیر اپنے حال کو سمجھ سکتی ہے نہ مستقبل کے بارے میں کوئی رویہ اختیار کر سکتی ہے۔

''آگ میں پھول'' کی تدوین و ترتیب میں میرے پیش نظر یہی بات رہی ہے کہ اپنی شاعری اور اپنی زندگی کے اس دور کو محفوظ کر دیا جائے جو ۵۵ء تک گزار چکا ہوں۔اس ایڈیشن میں وہ کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے جو اُس وقت میری دسترس میں نہیں تھا۔ضخامت سے بچنے کی خاطر میں نے اپنی دو طویل نظمیں 'شعلۂ بے دود' اور 'بنگال سے کوریا تک' کو اپنی تیسری کتاب 'تشنگی کا سفر' میں دیگر طویل نظموں کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔

تازہ اشاعت میں آپ کچھ تبدیلیاں دیکھیں گے جو نظر ثانی کرتے ہوئے عمل میں آئیں۔اسے 'خوب سے خوب تر کی جستجو' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔آیئے اب میں آپ کو اپنی عمر کے اس دور میں لے چلوں۔۔۔'جن دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا'

حمایت علی شاعر

(۱۹۸۰ء)

نظمیں

یوں کتنی نگاہوں کا سندیسہ نہ ملا
دل ایسا تھا پتھر کہ کسی کا نہ ہوا
اب حال مگر یہ ہے کہ دھڑکن نہ سکوت
کیا جانیے اس ایک نظر میں کیا تھا

جنت نگاہ

آج یہ کس سر زمیں کا آسماں آنکھوں میں ہے
جو کبھی دیکھا نہیں تھا، وہ سماں آنکھوں میں ہے
شاخ جسموں پر مہکتے پھول چہروں کی بہار
زندگی کے پھول بن کا اِک جہاں آنکھوں میں ہے
رنگ روشن ہیں کہ رنگیں روشنی کا گلستاں
چھوٹتی مہتابیوں کی کہکشاں آنکھوں میں ہے
دل کی دھڑکن میں ہے رقصِ بے خودی کی کیفیت
آنکھ سے اوجھل تھا جو وہ جانِ جاں آنکھوں میں ہے
خواب میں بیدار ہوں یا ہے یہ بیداری کا خواب
روح میں حسنِ یقیں، حسنِ گماں آنکھوں میں ہے
اب سے پہلے تو کبھی اتنی حسیں دنیا نہ تھی
آج کس کا حسن زیرِ آسماں آنکھوں میں ہے
میں تو شاعر ہوں بھلا دیکھوں نہ کیوں میں بھی وہ خواب
جو غموں سے دُور، میری خوش گماں آنکھوں میں ہے

حسنِ بے نام

آنکھوں میں بسا رہتا ہے وہ پھول سا چہرہ
وہ پیکرِ گُل جس کا کوئی نام نہیں ہے
وہ حسن جسے دیکھ کے اِک نشہ سا چھا جائے
وہ نشہ جو مرہونِ مئے و جام نہیں ہے

میں نے اُسے دیکھا تھا کہاں، یاد نہیں کچھ
کب دل میں وہ تصویر اُتر آئی نہیں معلوم
ہاں دل کے دھڑکنے کی صدا یاد ہے اور پھر
کب شام ہوئی کب سحر آئی نہیں معلوم

کچھ ایسا تھا عالم کہ ہر اِک سمت فضا میں
اِک کیفیتِ خواب بصد رنگ رواں تھی
آئینے کی مانند چمک اُٹھی تھی دنیا
نظروں سے کوئی چیز نہاں تھی نہ عیاں تھی

اب تک اُسی عالم میں ہیں کھوئی ہوئی آنکھیں
جاگی ہوئی آنکھیں ہوں کہ سوئی ہوئی آنکھیں

O

ایک پرچھائیں سی آوارہ ہے ویراں دل میں
جانے کیوں اُس کے تعاقب کا ہے ارماں دل میں

پیکرِ خیال

تجھ سے مل کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے
جیسے تو مجھ سے بہت دور نہیں تھی پہلے
خواب کی طرح نگاہوں میں تھی موجود کہیں
یا مری روح میں آباد کہیں تھی پہلے

میں نے تجھ کو کبھی دیکھا تو نہیں تھا لیکن
تو ہر اِک شئے میں تھی آئینۂ فطرت بن کر
لبِ خنداں میں تھی بے وجہ تبسم کی طرح
دل میں بیدار تھی بے نام مسرت بن کر

یہ خدوخال ہیں میرے لیے اتنے مانوس
جیسے خود میرے تصور نے تراشا ہے انہیں
حسن کے جتنے مقامات ترے جسم میں ہیں
اپنے ہاتھوں، ترے پیکر میں سجایا ہے انہیں

اب تو جی چاہے کہ بس تیرا سراپا لکھوں
جب بھی لکھوں، ترے پیکر کا قصیدہ لکھوں

O

نازِ گل پیرہناں، نازشِ سیمیں بدناں
رشکِ مہتاب رخاں، حسرتِ شریں دہناں
تو کہ تیرے لبِ لعلیں، مرا عنوانِ غزل
تو کہ تیرے قدِ موزوں سے خجل سروِرواں
تیرا پیکر ہمہ نور و ہمہ نکہت، ہمہ رنگ
تیرے پَرتَو سے منور ہے مرا شعلۂ جاں

حسرتِ قرب

جیسے وہ خواب کی دنیا سے اُتر آئی تھی
میں نے دیکھا تو مرے دل نے یہ چپکے سے کہا
یہ حسیں شکل تو مانوس نظر آتی ہے
یہ خدوخال یہ قامت یہ سلونی رنگت
کوئی بھولی ہوئی تصویر دکھا جاتی ہے

یہ وہی روپ ہے جو صبح میں پنہاں تھا کہیں
یہ وہی رنگ ہے جو قوس قزح سے تھا عیاں
یہ وہی چہرہ ہے جو چاند سے جھانکا تھا کبھی
یہ وہی جسم ہے، چھونے کا جسے تھا ارماں

ہائے یہ لہجہ، یہ آواز، یہ اندازِ حیا
لب جو کھلتے ہیں تو غنچے سے چٹک جاتے ہیں
یہ تخاطب کا قرینہ، یہ ادائے گفتار
اِس ادا پر تو فرشتے بھی ٹھٹک جاتے ہیں

تم تو اِک شاعرِ فطرت ہو، تمہیں ہے یہ خبر
بزمِ فطرت ہے اِسی حسن کے پرتو سے حسیں
تم جن اشعار پہ نازاں ہو، وہ اشعار تمام
اِسی پیکر کے تصور سے ہوئے ہیں رنگیں

آج یہ حسنِ تصور، بہ ایں تزئینِ جمال
خواب و تعبیر کا سنگم ہے، ذرا دیکھو تو
آج یہ تم سے مخاطب بھی ہے، نزدیک بھی ہے
کیسا یہ سحر مجسم ہے، ذرا دیکھو تو

ایسے کافر سے تو ایمان ہے بیعت کرنا
خلوتِ خاص میں اِس بت کی عبادت کرنا

تری آنکھیں

شبِ سیہ میں چراغِ نظر تری آنکھیں
رہِ حیات میں رختِ سفر تری آنکھیں

تو ساتھ ہو کہ نہ ہو، زندگی کی راہوں میں
رہیں ہمیشہ مری ہم سفر تری آنکھیں

خدا کرے کہ میں بس جاؤں تیری آنکھوں میں
کیے رہیں مری آنکھوں میں گھر تری آنکھیں

طلوع ہو تری پلکوں کے سائے میں ہر صبح
جھکی رہیں مری ہر شام پر تری آنکھیں

مری نگاہ میں رہ کر بھی جانے کیوں اب تک
مری نگاہ سے ہیں بے خبر تری آنکھیں

O

میں خود غرض بھی ہوں کتنا کہ بس یہی چاہوں
رہیں ہمیشہ مری منتظر، تری آنکھیں

تصویر تمہاری

آنکھوں میں اُتر آئی ہے تصویر تمہاری
اِک پیکرِ رعنائی ہے، تصویر تمہاری

میں تو اُسے چپ چاپ یونہی دیکھ رہا تھا
کس بات پہ شرمائی ہے تصویر تمہاری

آئینہ در آئینہ رہے گی یونہی روشن
خوابِ شب تنہائی ہے تصویر تمہاری

کیوں مجھ کو اِس انداز سے وہ دیکھ رہی ہے
کیا میری تمنائی ہے تصویر تمہاری؟

اشعار میں پوشیدہ، تصور میں نمایاں
کس طرح سے ہاتھ آئی ہے تصویر تمہاری

ترک وطلب

اُس رات تمہاری آنکھوں میں اِک شوخ چمک تھی، آخر کیوں
خاموش لبوں میں کھلتے ہوئے پھولوں کی لہک تھی آخر کیوں
اُس رات سے اب تک جانِ وفا میں سوچ رہا ہوں صبح ومسا
جب ترک تعلق کر بیٹھے پھر دل میں للک تھی آخر کیوں

وہ خواب تھا یا بیداری تھی
وہ رات بہت ہی بھاری تھی

تم کو تو نہیں معلوم مگر اُس رات میں پل بھر سو نہ سکا
حسرت تھی تمہیں اپنانے کی اپنا بھی میں اب تک ہو نہ سکا

تماشا

زندگی کے خموش لمحوں میں
اکثر ایسا بھی وقت آتا ہے
جب میں اپنے قریب رہ کر بھی
دیر تک خود سے دور رہتا ہوں
اُلجھے اُلجھے خیال کے بادل
روح و دل پر محیط رہتے ہیں
دور تک ملگجی فضاؤں میں
میری نظریں بھٹکتی رہتی ہیں
اور پھر جانے کن خلاؤں میں
آپ ہی آپ ڈوب جاتی ہیں

وقت کا کارواں گزرتا ہے
اور مجھے کچھ خبر نہیں ہوتی
ایسے کٹتا ہے یہ سفر میرا
کوئی شے ہم سفر نہیں ہوتی

پھر یکا یک نہ جانے کیوں دل میں
ایک احساس جاگ اُٹھتا ہے
روح کے تار بجنے لگتے ہیں
اور میری نگاہ کے پنچھی
آشیانوں میں لوٹ آتے ہیں
میرے اطراف کی فضاؤں میں
پھول ہی پھول مسکراتے ہیں
اور میں کھلکھلا کے ہنستا ہوں
دور تک کوئی بھی نہیں ہوتا
اور میں گنگنائے جاتا ہوں

سوچتا ہوں کہ میں ہوں کیا آخر
آدمی ہوں کہ اِک کھلونا ہوں
کوئی عالم نہیں مرا عالم
زندگی کا عجب تماشا ہوں

غمِ رائیگاں

آنسوؤ، آج ساتھ دو میرا
آج میں اِس مقام پر ہوں جہاں
دل نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا
میری محرومیوں نے آخر کار
ہر طلسمِ فریب توڑ دیا

آج میری ہر ایک خوش فہمی
میرے خوابوں پہ طنز کرتی ہے
میری عمرِ رواں کی ہر ساعت
خندہ زن، طعنہ زن گزرتی ہے

مجھ کو ڈر ہے کہ میرا سوزِ دروں
میرا سب کچھ جلا نہ جائے کہیں
پیش و پس کی اُجاڑ تنہائی
مجھ کو چپ چاپ کھا نہ جائے کہیں

میں کہ اِس زندگی کے صحرا میں
اِک بگولے کی طرح اُڑتا رہا
کوئی منزل نہ ہم سفر کوئی
جس طرف راہ پائی مڑتا رہا

دل کو ہر گام پر کسی دل کی
کسی انسان کی تلاش رہی
لوگ ملتے رہے، بچھڑتے رہے
میرے کندھوں پہ میری لاش رہی

ایسے عالم میں یوں بھی ہوتا ہے
خود کو انساں فریب دیتا ہے
کسی تخئیل کے سہارے ہی
زندگانی گزار لیتا ہے

ایک واماندہ راہرو کے لیے
سنگِ راہِ سفر ہی کیا کم ہے
کوئی تسکین مستقل نہ سہی
راحتِ مختصر ہی کیا کم ہے

میں نے اِک بت کو زندگی دے دی
دل نے پتھر کو کر لیا ہم راز
ایک بے حس جسد کی نذر ہوا
میرے اشکوں کا سوز، دل کا گداز

کاش میں جانتا کہ پیکرِ سنگ
کبھی انسان ہو نہیں سکتا
کسی پتھر کے دل میں کوئی اشک
کوئی طوفاں سمو نہیں سکتا

میری محرومیوں نے آخر کار
ہر طلسمِ فریب توڑ دیا
سنگِ راہِ سفر نے پھر مجھ کو
راستے میں بھٹکتا چھوڑ دیا

آنسوؤ! آج ساتھ دو میرا
آج شاید یہ درد بٹ نہ سکے
آج دل کا عجیب عالم ہے
آج شاید یہ رات کٹ نہ سکے

تنہا تنہا

میں بہت تھک گیا ہوں
یہ کٹھن راستہ مجھ سے اب طے نہ ہوگا
یہ تمازت، یہ ویراں خموشی
جو ازل سے مری ہم سفر ہے
آج زنجیرِ پا بن گئی ہے
یہ ہوا جس کے دامن میں بکھری ہوئی خاک ہے
یا کہ سورج کی جھڑتی ہوئی راکھ ہے
میرے رستے میں دیوار سی بن گئی ہے

میں بہت تھک گیا ہوں
ایک پتھر کے مانند افتادہ
چپ چاپ بیٹھا ہوا سوچتا ہوں
میرے اطراف ہر چیز ٹھہری ہوئی ہے
پیڑ، سورج، پہاڑ۔۔۔آسماں
اس جہاں کی ہر اِک چیز ساکت ہے
کوئی نہیں جو مرا ہم سفر ہو
یہ طویل اور کٹھن راستہ مختصر ہو

O

شاید آ جائے کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
میں نے اِس آس پہ دروازہ کھلا رکھا ہے

وقت وقت کی بات

(قطعات)

قسمت

آپ انسان ہیں تو اِس سے کیا
کون سنتا ہے آپ کی فریاد
یہ تو قسمت کی بات ہے ہمدم
کوئی ناشاد ہے تو کوئی شاد

عزم

میں نے ٹھانی ہے اور ہی دل میں
چاہے وہ بات، بات ہو کہ نہ ہو
میں سنواروں گا گیسوئے ہستی
زندگی کو ثبات ہو کہ نہ ہو

دعوت

گر ہو سکے تو اور ستم مجھ پہ ڈھا کے دیکھ
ہاں آزما کے دیکھ، مجھے آزما کے دیکھ
اپنی نگاہِ عزم شکن کی قسم تجھے
نظر چرا کے دیکھ، نگاہیں ملا کے دیکھ

جیت

اپنی ہر جیت کو میں ہار سمجھ بیٹھا تھا
اُن کی خاموشی کو انکار سمجھ بیٹھا تھا
خامشی بھی ہے ادا اُن کی، مجھے کیا معلوم
میں تو اب زندگی بیکار سمجھ بیٹھا تھا

شادی کے بعد

لبوں پہ خندۂ بے اختیار آ ہی گیا
مری حیات پہ رنگِ بہار چھا ہی گیا
ہزار چاہا زمانے نے میں تباہ رہوں
مگر کوئی مجھے اپنے گلے لگا ہی گیا

(مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔فروری ۱۹۵۰ء)

ادھوری کہانی

آج سے چند برس قبل کہ جب تو بھی نہ تھی
اور کوئی بھی مرا مونس و غمخوار نہ تھا
شہر کے کوچہ و بازار تھے اور میرے قدم
اور کوئی مری محنت کا خریدار نہ تھا
میری حالت سے کسی کو بھی سروکار نہ تھا

تھک کے رہ جاتے مرے پاؤں، میں چلتا رہتا
بھوک کی آگ کو پانی سے بجھاتا رہتا
ایک ان جانی مسرت کی لگن دل میں لیے
اپنی بیزار طبیعت کو لبھاتا رہتا
نت نئی راہ اُمیدوں کو دکھاتا رہتا

جانے وہ کیسی مسرت تھی کہ جس کی خاطر
زہر کو زہر سمجھ کر بھی پیے جاتا تھا
زندگی عرصۂ سکرات ہوئی جاتی تھی
اور میں موت کے سائے میں جیے جاتا تھا
اپنے دامانِ دریدہ کو سیے جاتا تھا

یک بہ یک تجھ سے کسی روز ملاقات ہوئی
دور نظروں میں کوئی رنگ سے برسانے لگا
گنگناتے ہوئے بیدار ہوئے روح کے تار
دل کے نزدیک کوئی گیت سا لہرانے لگا
اپنے اطراف کی ہر چیز پہ پیار آنے لگا

تو دبے پاؤں چلی آئی مرے دل کے قریب
اور میں بھول گیا میری حقیقت کیا ہے
میں کہ افلاس مری جہدِ مسلسل کا صلہ
میری دنیا میں ترے پیار کی وقعت کیا ہے
بھوک کیا جانے کہ تعظیمِ محبت کیا ہے

میں کہ اِس دشتِ غمِ زیست کا تنہا رہرو
اپنی راہوں کے خم و پیچ سے اکتایا ہوا
کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، غمخوار نہیں
ایک دل وہ بھی غمِ دہر سے گھبرایا ہوا
سہما سہما ہوا ہر گام پہ تھرایا ہوا

تیری آنکھوں میں محبت کا اشارہ پا کر
میری آنکھوں میں بھی اِک خواب سا لہرا ہی گیا
میں نے تیرے لیے دنیا سے بغاوت کر دی
اور بہر حال ترے پیار کے اپنا ہی گیا
اپنی قسمت کو تیرے پیار سے چمکا ہی گیا

کیسی کیسی نہ اُمنگیں تھیں، تمنائیں تھیں
تو دلہن بن کے جب آئی مرے غم خانے میں
چاندنی وسعتِ گردوں سے سمٹ آئی تھی
میری آنکھوں کے چھلکتے ہوئے پیمانے میں
ایک جنت تھی پشیماں مرے ویرانے میں

سوچتا تھا کہ خود اِس آگ میں جل جاؤں مگر
تجھ کو سرتا بہ قدم رشکِ گلستاں کردوں
نکہت و رنگ لٹاتے ہوئے محلوں کی طرح
تیری دنیا کو بھی فردوس بہ داماں کردوں
زندگانی کی حقیقت کو فروزاں کردوں

کہکشاں دور سے ہنس ہنس کے اشارے کرتی
اور میں ایک نظر ڈال کے بڑھ جاتا تھا
زندگی میرا ہر اِک گام اُڑاتی تھی مذاق
پاؤں اُٹھتے ہی نیا جال اُبھر آتا تھا
چار جانب سے اندھیرا مجھے دہلاتا تھا

رات دن فکرِ معاش اور فقط فکرِ معاش
بس یہی محورِ تاریک تھا اور میری حیات
کون سی صبح پسینے میں شرابور نہ تھی
کس شبِ ماہ نے پائی غمِ فردا سے نجات
ایک تھی میرے لیے دھوپ ہو یا چاندنی رات

تو مری فکرِ شب و روز سے واقف تھی مگر
اور کیا غم ہیں مجھے، یہ تجھے معلوم نہ تھا
تو کسی حال میں ہو ہنستی ہی رہتی تھی سدا
تیری آنکھوں میں شکایت کا بھی مفہوم نہ تھا
یوں بہ ظاہر ترا اِک لمحہ بھی مغموم نہ تھا

روز و شب کٹتے رہے، وقت گزرتا ہی رہا
اور اِک لمحۂ بے فکر بھی ہم پا نہ سکے
دور نظروں میں کسی جنت گم گشتہ کا عکس
مسکراتا رہا اور ہم اُسے اپنا نہ سکے
زیست کو زیست کا آئینہ بھی دکھلا نہ سکے

تیرے ملبوس میں پیوند ابھی ہیں کہ جو تھے
رنگ کجلائے چلا جاتا ہے چولھے کا دھواں
آنکھ کے گرد سیاہی سی بڑھے جاتی ہے
کھا گیا تیری جوانی کو ترا سوزِ نہاں
کتنا بے درد ہے، بے رحم نظامِ دوراں

(مطبوعہ 'شاعر' بمبئی دسمبر ۱۹۵۵ء)

وہ

وہ برق جس کے تعاقب میں آج تک تھی نگاہ
وہ برق آج مچلتی ہے میری بانہوں میں
وہ چاند، تھا جو تصور کو جگمگائے ہوئے
وہ چاند آج فروزاں ہے میری راہوں میں
وہ روپ جس کی جوانی پہ آفتاب خجل
وہ روپ آج ہے رقصاں مری نگاہوں میں
سنور سنور کے بکھرتا ہے خواب گاہوں میں

وہ بنتِ ماہ وہ خلدِ بریں کی برنائی
نگار خانۂ فطرت کا اِک حسیں شہکار

وہ حسن کارِ اجنتا کے خواب کی تعبیر
وہ اِک بہارِ مجسم اک آتشیں گلزار
وہ سر سے پاؤں تلک آسماں کی حور کوئی
مِرے خدا کے کمالِ ہنر کی آئینہ دار
تمام حسن و جمالِ بہشت اس پہ نثار

وہ میرے دشتِ تمنا کی آخری منزل
وہ میرے عشق کی معراج، زیست کا پندار
وہ میری سرد سی راتوں میں دوپہر کی دھوپ
وہ دوپہر میں خنک چاندنی کی نرم پھوار
وہ ایک گیت، وہ خلوت کا نغمۂ دلرس
وہ اِک غزل کہ مرصع ہیں جس کے سب اشعار
وہ جس کے کیف سے ہے، میری زندگی سرشار

'مری ○ حیات، مری کائنات، مرا ثبات'

○ مخدوم محی الدین کا مصرعہ

تیری باتیں، تیرے خواب

(اپنا گھر چھوٹنے کے بعد)

اے مری جان، مرے خوابِ وفا کی تعبیر
آج جی چاہتا ہے تجھ کو بہت پیار کروں
تیری فرقت میں گزرتا ہے جو عالم مجھ پر
آج اُس کرب کا اشعار میں اظہار کروں

یاد ہے تجھ کو، ترے گاؤں کی وہ چاندنی رات
جب تجھے چھونے کی معصوم جسارت کی تھی
کتنی بیدار تھی خوابیدہ جوانی تیری
تو نے 'باچشمِ حقارت' جو عنایت کی تھی

جانے وہ تیری ادا تھی کہ حقیقت کا جمال
کس قیامت کی تھی وہ تند نگاہی تیری
رخ پہ بکھری ہوئی زلفوں میں وہ ابرو کا تناؤ
اِک گنہ بن گئی، ناکردہ گناہی میری

دل نے چپکے سے کہا، شاعرِ آوارہ مزاج
تیری بے نام تمنا کی یہی ہے معراج
انہیں قدموں پہ جھکا دے سرِ مغرور اپنا
یہی خاکِ کفِ پا ہے ترے ہر غم کا علاج

اب اِسی خاک سے تعبیر ہے میری دنیا
یہی خاکِ کفِ پا، سرمۂ چشمِ دل ہے
اِسی مٹی میں کھلایا ہے گلستاں میں نے
یہی مٹی مری معراج، مری منزل ہے

O

آج میں دور یہاں گوشۂ تنہائی میں
تیری تصویر سے بہلاتا ہوں جب دل اپنا
تیرے قدموں کی حسیں خاک اُڑی آتی ہے
اور میں دیکھنے لگتا ہوں وہ رنگیں سپنا

میرے غم خانے میں اِک چاند اُتر آیا تھا
جس کے آغوش میں بیدار تھی وہ گاؤں کی رات
تجھ کو چھونے کی وہ جھجکی ہوئی حسرت دل میں
وہی سوئے ہوئے جاگے ہوئے گم سم لمحات

وہ تری شرم سے جھکتی ہوئی لرزاں پلکیں
وہ لجائی ہوئی، سہمی ہوئی دل کی دھڑکن
وہ سلگتے ہوئے رخسار، لرزتے ہوئے ہونٹ
اولیں پیار کی حسرت میں وہ بیدار بدن

یاد ہے تجھ کو وہ گھونگھٹ کے اُلٹنے کا سماں
جب مری آنکھوں نے جی بھر کے تجھے دیکھا تھا
تیرے ہونٹوں پہ تھے جب میرے لبوں کے سائے
جسم و جاں میں کوئی طوفان اُمڈ آیا تھا

کس قدر تیز تھا طوفان کے دھاروں کا بہاؤ
موج سے موج لپٹتی تھی، بکھر جاتی تھی
وہ اُلجھتی ہوئی سانسوں میں دلوں کی دھڑکن
کس قیامت کے مراحل سے گزر جاتی تھی

ہائے وہ لمحہ جسے عمر کا حاصل کہیے
کتنی صدیاں اُسی لمحے میں اُتر آئی تھیں
ایک خاموشی میں پنہاں تھیں ہزاروں باتیں
اپنی خوش بختی پہ آنکھیں مری بھر آئی تھیں

میں نے مانگا تھا تجھے اپنے خدا سے جاناں
مرے اللہ نے سن لی مری فریاد خموش
میں نے چاہا تھا ترے پاؤں کی مٹی چوموں
میری آنکھوں سے لگی ہے تری گردِ پاپوش

کاش اِس گرد کو میں کاہکشاں کر پاتا
کاش اِن پیروں کو پھولوں میں سجا کر رکھتا
کاش اِس حسن کی ہر لمحہ عبادت کرتا
کاش اِس جسم کو سینے سے لگا کر رکھتا

O

آج جب دور ہوں تجھ سے تو میں یہ سوچتا ہوں
کتنا بدبخت ہے دل، کتنا گنہ گار ہوں میں
اور تو کوئی مسرت میں تجھے دے نہ سکا
ایک قربت تھی، تو اُس کا بھی خطا وار ہوں میں

جانے کب ختم ہو یہ سلسلۂ کربِ فراق
جانے کب تک ترے قدموں سے رہے دور جبیں
جانے کب گاؤں کا وہ چاند زمیں پر اُترے
اور ہم دیکھیں بہم مل کے وہی خوابِ حسیں

وہ حسیں خواب کہ ہے میرے ہر اِک غم کا علاج
میرا حاصل، میری خاموش وفا کی معراج

غمِ حاصل

اُس کو پا کر بھی دل افسردہ رہا کرتا ہے
اُس کو پا کر بھی کسی شے کی کمی ہے شاید
چشمِ خنداں کی چمک دیکھ کے آتا ہے خیال
یہ تبسم نہیں، اشکوں کی نمی ہے شاید
جسم اِک برق کا پیکر ہے، نظر کو تسلیم
دل کو ہر دم یہ گماں، برف جمی ہے شاید

عشق تو خیر ہے اِک جذبۂ سوزاں کہ جسے
کسی سائے کسی ٹھنڈک کی ضرورت ہی نہیں
کوئی آندھی، کوئی طوفاں ہو بہ فیضِ غمِ دل
اس دیے کو کسی فانوس کی حاجت ہی نہیں
عجز اتنا کہ اِک آنسو میں سمٹ کر رہ جائے
اور پندار کہ احساسِ ہزیمت ہی نہیں

پھر یہ اک خار سا جو دل میں کھٹکتا ہے مدام
آخر اِس کربِ مسلسل کی حقیقت کیا ہے
نوجوانی تو ہے خود اپنی جگہ حسنِ تمام
اس کو آرائشِ قامت کی ضرورت کیا ہے
دل کی دھڑکن کا تقاضہ تھا کہ دو دل مل جائیں
پھر یہ خاموش سا احساسِ ہزیمت کیا ہے

سوچتا ہوں تو غمِ دل پہ ہنسی آتی ہے
کتنے نادان ہیں ہم عشق کے مارے ہوئے لوگ
زندگی کیا ہے حقیقت میں سمجھتے ہی نہیں
اپنے ماحول کی قبروں میں اُتارے ہوئے لوگ
ایک موہوم تصور ہے کہ جس کے اطراف
گھومتے رہتے ہیں ہم زیست سے ہارے ہوئے لوگ

وہ حسیں روپ کہ جس کے لیے دل نے اب تک
کسی کعبے، کسی بت خانے میں سجدہ نہ کیا
ہر شبِ ہجر گزاری ہے بہ اندازِ وصال
کسی غم کو کبھی خلوت میں بھی رسوا نہ کیا
ہر نفَس ایک جہنم کی تپش سے گزرا
اور اشکوں سے بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہ کیا

وہ حسیں روپ بھی آخر ہے اک انساں پیکر
اور وہ پیکر کسی پتھر کا تراشیدہ نہیں
کوئی انسان ہو، دل ہے تو یہ دنیا بھی ہے
اور اس شیشے سے نازک تو کوئی شیشہ نہیں
آدمی کیا ہے اگر حسِ لطافت مٹ جائے
زندگی کیا ہے، گر آسائش یک لمحہ نہیں

آج جب عشق، غمِ زیست سے ٹکرایا ہے
ٹوٹ کر رہ گیا خوابوں کا ہر اِک تاج محل
کسی تخئیل کو اب دعویٰء فردوس نہیں
دل ہے اب اپنی تمناؤں کا خود اک مقتل
کوئی ساعت ہو، کوئی راہ گزر ہو ہر گام
زیست کی تاک میں بیٹھی نظر آتی ہے اجل

جبرِ عہد

(ملازمت سے ہٹائے جانے پر)

تم خلاؤں میں نظر گاڑ کے کیا دیکھتی ہو
اِن خلاؤں میں بجز حسنِ نظر کچھ بھی نہیں
اپنی دنیا کا خداوند تو ہے سکۂ زر
اپنی دنیا میں بجز سکۂ زر کچھ بھی نہیں

یہ جہاں ایک دکاں ہے کہ جہاں صبح و مسا
آدمی بکتے ہیں نیلام کی چیزوں کی طرح
شب کی تاریکی ہو یا دن کا اُجالا ہر وقت
راحتیں بٹتی ہیں محلوں میں کنیزوں کی طرح

وال اسٹریٹ ۰ سے تا 'ارضِ خدائے کونین'
آدمی آدمی کو کھائے چلا جاتا ہے
اِک طرف خوں ہے کہ بہتا ہے پسینہ ہو کر
اِک طرف چہروں پہ رنگ آئے چلا جاتا ہے

آج گر میرا پسینہ، مرے خوں کی سرخی
کسی رخسار، کسی لب کے کسی کام آئی
کیا نیا جرم ہوا، کون سی تقصیر ہوئی
زندگی آج تلک اپنے کسی کام آئی؟

۰ نیویارک کی ایک سڑک جہاں امریکہ کے بڑے تجارتی مراکز ہیں۔

۰ اشاعت اول بعنوان 'ایک بات' مشرب کراچی۔ مارچ ۱۹۵۴ء

O

دلوں کا درد نگاہوں سے پھوٹ پڑتا ہے
ہزار ضبط کریں اشک ٹوٹ پڑتا ہے

وحشتِ بام و در

جب بھی گھر کا خیال آتا ہے
قبرستان کی ویرانی سی
قلب و نظر پر چھا جاتی ہے
گرد و پیش کے ہنگاموں کو
روح کی وحشت کھا جاتی ہے
ایک بھیانک سی خاموشی
ہر اِک راہ پر چھا جاتی ہے
سینے میں دم گھٹ جاتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے

دو آنکھیں دو ویراں آنکھیں
دور خلاء میں تکتی ہوں گی
روتے ہوئے بچوں کی چیخیں
سارے گھر میں بھٹکتی ہوں گی
میری آس میں چلتی سانسیں
خشک گلے میں اٹکتی ہوں گی
دل پر پتھر برساتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے

جس جانب بھی نظر کرتا ہوں
کوئی مجھ پر ہنس پڑتا ہے
چاکِ جیب و تہی دامن پر
ایک اِک منظر ہنس پڑتا ہے
میری ہر اِک جہدِ بقا پر
قبر کا پتھر ہنس پڑتا ہے
آنکھ میں خون اُتر آتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے

کھلونے

حسیں دکانوں کے شیش زنداں میں بند
حسرت بھری نگاہوں سے ایک اِک راہرو کو تکتے ہوئے کھلونو
میں جب بھی اِس راستے سے گزرا
تمہارے ہونٹوں کی بولتی خامشی نے اکثر
ہمک کے آواز دی ہے مجھ کو
تمہاری ٹھٹکی ہوئی نگاہیں
مچل کے لپکی ہیں میری جانب
تمہارے ننھے سے دست و بازو
مجھے بلاتے رہے ہیں اکثر
مگر مرے ہونٹ چپ رہے

میرے ہاتھ اُٹھ اُٹھ کے رہ گئے ہیں
نگاہیں تم پر پڑیں مگر۔۔۔دوسرے ہی لمحے
اُداس لوٹ آئیں اپنے تاریک محسبوں میں

میں تم سے کہتا بھی کیا رفیقو!
کہ میں تو خود بھی ہوں اِک کھلونا
جو بیچنے کے لیے سجایا گیا ہے دوکانِ شیشہ گر میں
تمہاری ہی طرح میں بھی صدیوں سے ہوں گرفتِ نظامِ زر میں

O

کسی کی یاد نے چھیڑے ہیں جب بھی روح کے تار
ٹھہر گئی مری دنیا میں وقت کی رفتار

تمام رات مسلسل پڑی ہے اوس مگر
سحر ہوئی تو فروزاں تھی آتشِ گلزار

چل خسرو گھر اپنے۔۔۔

تھک چکے پاؤں بس اب اے دلِ ناداں چل بھی

چل کہ اب رات کا نشہ بھی ہے مائل بہ خمار
قمقمے اونگھ رہے ہیں کہ بہت جاگ چکے
کچھ ستارے ہیں تو اُن کی بھی ہیں پلکیں بوجھل
وہ بھی تیرے لیے نیند اپنی بہت تیاگ چکے

چاند، پہرے کے سپاہی کی طرح استادہ
سوچ میں ہے کہ جو تو، جائے تو وہ بھی چل دے
رہگزر ایک طوائف کی طرح وامانده
ایسے لیٹی ہے کہ کون آئے گا اب رات گئے

ایک اِک ذرے کی آنکھوں میں ہے نیند آئی ہوئی
تو بھی گھر چل کے ذرا دیر، مرے دل، سو لے
کوئی ایسا نہیں اِس وقت جو تیری خاطر
چند لمحوں کے لیے ہی سہی، آنکھیں کھولے

اتنا خاموش ہے ماحول کہ چلتے ہوئے اب
اپنی آوازِ کفِ پا بھی گذرتی ہے گراں
تیری دھڑکن مری سانسوں کی ضمانت ہی سہی
تیری چپ چاپ سی دھڑکن بھی ہے وحشت ساماں

کب تک اِس قبر کی وادی میں پھرے گا پاگل
یوں کبھی مل بھی سکی ہے غمِ دوراں سے نجات
چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تیری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل، ترا عنوانِ حیات

اور تجھے جینا ہے اے کشتۂ دوراں، کل بھی

○ اشاعت اول بعنوان 'آخر شب'

مژدۂ نو

(اپنی ننھی بیٹی آسماں کی وفات پر)

لو یہ اِک مژدۂ نو بھی سن لو
میرے زنداں کے نئے دربانو
میرے محبوب سیاست دانو
لو یہ اِک مژدۂ نو بھی سن لو
آج اِک اور ستارہ ٹوٹا
زندگی کا کوئی پھوڑا پھوٹا
ایک انسان سے پیچھا چھوٹا

(۱۹۵۲ء)

جاوداں

(جاوداں میر۔۔۔اپنی بیٹی کے نام)

یہ میری بیٹی، یہ زندگی کے حسین خوابوں کی ایک منزل
مری محبت بھری رفاقت کا، میرے عہدِ وفا کا حاصل

یہ ننھی سی شمع جس کی لو میں مرا لہو سانس لے رہا ہے
مری نگاہ و خرد کو رازِ بقاء کا عرفان دے رہا ہے

میں سوچتا ہوں کہ فرد کی زندگی بھی کتنی جماعتی ہے
اِک آدمی کی جسد میں اِک کائنات خاموش سو رہی ہے

کلی کی ننھی سی گود میں محوِ خواب ہیں گلستاں ہزاروں
زمیں کے ایک ایک ذرے میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہزاروں

نہایتِ قطرہ، ابر باراں، مآلِ خورشید، کہکشاں ہے
قدم قدم پر ہے موت لیکن حیات کا کارواں، رواں ہے

O

عروسِ گیتی کے رُخ پہ بادِ سموم نے لاکھ دھول اُڑائی
سحر نے اُٹھ کر دھلا دیا منہ، تو شام گیسو سنوار آئی

ہزار طوفاں اُمڈ کے لپکے، بپھر بپھر کر اُٹھے بگولے
کسی میں جرأت ہوئی نہ اتنی، اچھل کے شمس وقمر کو چھو لے

ہزار بجلی نے دانت پیسے، گرج گرج کر گھٹائیں چھائیں
شعاعیں قوسِ قزح کی مالا فضا کی گردن میں ڈال آئیں

خزاں بدل لے ہزار پہلو، بہار زد میں نہ آ سکے گی
حیات کی رنگ رنگ وادی پہ موت چھائی نہ چھا سکے گی

O

میں اپنی بچّی کو دیکھتا ہوں تو آپ ہی آپ دل کے اندر
کچھ ایسی ہوتی ہے گدگدی سی کہ جاگ اُٹھیں قہقہے لبوں پر

میں لاکھ خود کو سنبھالتا ہوں، بہک ہی جاتے ہیں میرے پاؤں
کوئی مسلسل یہ چاہتا ہے کہ خوب ناچوں، اُدھم مچاؤں

چٹکنے لگتی ہیں خوں میں کلیاں، بہکنے لگتی ہے دل کی دھڑکن
شعور کی سرحدوں کو یک لخت پھاند آتا ہے میرا بچپن

جبیں کی شکنوں کا یہ تقاضا، وقارِ عمر رواں سنبھالوں
ہمکتے دل کی یہ ضد کہ فکر و نظر کی ہر شمع کو بجھا دوں

O

یہ ننھی سی شمع جس کی لو میں ابھی کوئی روشنی نہیں ہے
نظر کا حسن فریب دیکھو، ابھی سے میری نظر کہیں ہے

میں اِس کے چہرے میں اپنے خوابوں کا حسنِ تعبیر دیکھتا ہوں
میں اپنے فردا کے آنکھ اوجھل اُفق کی تنویر دیکھتا ہوں

میں دیکھتا ہوں کہ میں تناسخ کے اِک عمل سے گذر رہا ہوں
میں اپنے انجام تک پہنچ کر پھر اپنا آغاز کر رہا ہوں

مری شریکِ حیات اور میں، جو دو تھے اب ایک ہو گئے ہیں
ہمارے عہدِ وفا کے لمحات آج سب ایک ہو گئے ہیں

نئے خدوخال سے ہمارے جسد کی تشکیل ہو رہی ہے
ادھورا پن ختم ہو رہا ہے، ہماری تکمیل ہو رہی ہے

(۱۹۵۳ء)

غمِ فردا

(اپنے ننھے سے بیٹے 'روشن خیال' کے نام)

اُداس بیٹھی ہو کس لیے تم
سنو، ذرا اِس طرف تو دیکھو
تمہارا ننھا سا بچہ تم کو
اُداس سا دیکھ کر تمہیں کن عجیب نظروں سے تک رہا ہے
تمہارے پیہم سکوت پر اُس کا ننھا سا دل دھڑک رہا ہے
کوئی تبسم! کوئی تکلم!!

سنو یہ حالاتِ زندگانی
سدا تو یوں ہی نہیں رہیں گے
کہ لوگ کب تک ستم سہیں گے
یہ ٹھیک ہے اپنے دیس میں آج زندگی، زندگی نہیں ہے
مگر کوئی ایک دل بھی ایسا ہے جس میں برگشتگی نہیں ہے
یہی ہے اثباتِ زندگانی

زمانہ جوں جوں گزر رہا ہے
ہر ایک زنجیر کٹ رہی ہے
بساطِ عالم اُلٹ رہی ہے
یہ بات ممکن ہے اپنی آنکھیں نہ دیکھ پائیں وہ صبحِ فردا
مگر یہ ننھا سا بچہ جس نے ابھی ابھی پاؤں چلنا سیکھا
تمہارے چہرے سے ڈر رہا ہے

مطبوعہ 'فنکار' دہلی ۱۹۵۴ء

معراج کے نام

(روبینہ کی سالگرہ کا تحفہ ملنے پر)

رو نہیں میری زندگی ۔۔۔ مری جاں
میں نے سچ مچ نہ جانے کیوں اِک دم
تیری خوشیوں کا لطف چھین لیا
تو ہنسے جا رہی تھے اور میں نے
اُس ہنسی کا گلہ دبوچ دیا

جانے کیوں، میری دوست، بعض اوقات
چھایا رہتا ہے مجھ پہ پاگل پن
مستقل جبر و ضبط کے باوصف
ٹوٹ جاتا ہے دل کا ہر بندھن

سوچتا ہوں تو سینکڑوں ہی خیال
ذہن میں رقص کرنے لگتے ہیں
سینکڑوں حادثوں کے نشترِ غم
دل میں اِک ساتھ اُترنے لگتے ہیں

ساری دنیا، تمام پست و بلند
میری نظروں میں گھوم جاتے ہیں
ساری دنیا کے دل بہ چشمِ نم
اپنے دکھڑے مجھے سناتے ہیں

کوئی بڑھیا مرے قریب آ کر
سر پہ رکھتی ہے اتنے پیار سے ہاتھ
جیسے میں ہی ہوں اُس کا لختِ جگر
اُس کو میری تلاش تھی دن رات

پھر وہ بڑھیا پلک جھپکتے ہی
دھار لیتی ہے اِک دلھن کا روپ
جو کبھی چاندنی سی لگتی ہے
اور کبھی شام کی اُترتی دھوپ

پھر یکایک اُسی دلھن کا جمال
پالنے میں ہمکنے لگتا ہے
میری روبینہ کی طرح اِک دم
زندگی سے اُلجھنے لگتا ہے

زندگی کیا ہے، دودھ کی بوتل
زندگی کیا ہے، ایک نانِ جویں
ایک آسودہ حال ماں کی گود
ایک دلہن کی جگمگاتی جبیں

میری روبینہ، یہ مری گڑیا
جانے اُس کو دکھائے کیا تقدیر
اُس کے حق میں بنے گا 'یہ زیور'
کوئی پازیب یا کوئی زنجیر

تم کو بھی کیا دیا مقدر نے؟
ایک چھوٹا سا جھونپڑا ۔۔۔ بچے
ایک شوہر ۔۔۔ غریب اور شاعر
تم نے دیکھے تھے خواب کیا 'سچے'

(۱۹۵۶ء)

۔(روبینہ میری بیٹی فروزاں علی کی عرفیت ہے۔شاعر)

اقبال اور میں

فکرِ اقبال کی تاثیر کہوں
یا اِسے اپنی حقیقت سمجھوں
جب بھی پڑھتا ہوں کلامِ اقبال
ایسا لگتا ہے میں کچھ اور ہی ہوں

میں کہ انسان ہوں، اِک خاک نشیں
دونوں عالم ہیں مگر مجھ میں مکیں
پیکرِ خاک سہی، میرا وجود
میری فطرت نہیں پابندِ زمیں
میری دنیا، یہی دنیا ہے مگر
میری دنیا، اِسی دنیا میں نہیں
میری آنکھیں ہیں مرے شمس و قمر
کہکشاں ہے مری تحریرِ حسیں

میرے سائے میں ہے سمٹی ہوئی شام
مطلعِ صبح --- مرا نورِ جبیں
میری باہوں میں ہیں انسان تمام
میرا سینہ ہے ہر اِک غم کا امیں
میرا برزخ، میری دوزخ، میری خلد
میرے خونِ رگِ جاں میں ہے کہیں
وقت کیا ہے، مرا اندازِ خرام
زندگی کیا ہے، مرا حسنِ یقیں
کرۂ ارض مرا نقشِ قدم
بزمِ آفاق مرے زیرِ نگیں
میری گردِ رہِ منزل، افلاک
میرے زیرِ کفِ پا، عرشِ بریں

اپنی تخئیل میں آباد ہوں میں
اپنے خلاق کا ہمزاد ہوں میں

آدمی کی کہانی

یہ آدمی کہ کہانی بھی ہے عجیب و غریب

میں سوچتا ہوں کہ جب آدمی نے ڈرتے ہوئے
رہِ حیات میں پہلا قدم رکھا ہو گا
تو اِس خرابۂ آباد میں تنِ تنہا
جدھر نگاہ اُٹھی آپ چل پڑا ہو گا
کبھی بلند چٹانوں کے درمیاں خود کو
بہت حقیر سی مخلوق دیکھتا ہو گا
کبھی زمیں، کبھی خورشید پر نظر ہو گی
کبھی خود اپنے ہی سائے سے ڈر گیا ہو گا
کبھی خود اپنی نگاہوں سے چھپ کے غاروں میں
ہزار خوف لیے دل میں جاگتا ہو گا
کبھی وسیع سمندر کو دیکھ کر چپ چاپ
خود اپنے جسم کے اندر سمٹ گیا ہو گا

O

اور آج بھی ہے وہی آدمی مگر یہ زمیں
رہِ حیات میں ہے ایک منزلِ گزراں
ہیں سب ثوابت و سیّار اُس کی گردِ سفر
تمام وسعتِ آفاق اُس کی حدِ مکاں
جو آئینے کی طرح حیرتی رہا کل تک
اب اُس کو دیکھ کے ہے کائنات خود حیراں
عجب خمیر ہے اُس کا کہ جتنا غور کریں
دکھائی دیتے ہیں اُس میں ہزار ہا امکاں
ہر ایک منزلِ نایافت اُس کی زد میں ہے
یہ مشتِ خاک، کہاں سے پہنچ گئی ہے کہاں
یہ اور بات کہ اِس اوج پر پہنچ کر بھی
وہ آدمی ہے اِک انجانے خوف سے لرزاں
سکون کل تھا میسر نہ آج ہی ہے نصیب
یہ آدمی کی کہانی بھی ہے عجیب و غریب

ترغیب

کل شب عجیب ادا سے تھا اِک حسن مہرباں

وہ شبنمی گلاب سی رنگت دُھلی دُھلی
شانوں پہ کھیلتی ہوئی زلفیں کھلی کھلی
ہر خطِ جسم، پیرہنِ چست سے عیاں
ٹھہرے بھی گر نگاہ تو ٹھہرے کہاں کہاں
ہر زاویے میں حسن کا اِک تازہ بانکپن
ہر دائرے میں کھلتے ہوئے پھول کی پھبن
آنکھوں میں ڈولتے ہوئے نشے کی کیفیت
روئے حسیں پہ ایک شکستہ سی تمکنت
ہونٹوں پہ اَن کہی سی تمنا کی لرزشیں
بانہوں میں لمحہ لمحہ سمٹنے کی کاوشیں

سینے کے جزرومد میں سمندر سا اضطراب
اُمڈا ہوا سا جذبۂ بیدار کا عذاب
خوشبو طوافِ قامتِ زیبا کیے ہوئے
شیشے سا جسم عزمِ زلیخا لیے ہوئے

پھر یوں ہوا کہ چھڑ گئی یوسف کی داستاں
پھر میں تھا اور پاکیء دامن کا امتحاں
اِک سانپ ○ بھی تھا آدم وحوا کے درمیاں

○ انجیل کی روایت ہے کہ شیطان نے سانپ کی شکل میں آدم وحوا کو ورغلایا تھا (شاعر)

O

کٹ ہی جائے گی زیرِ سایۂ زلف
اور تھوڑی سی رات باقی ہے

تین روپ

(۱)

سانجھ سمئے سی سانوری صورت، بال گھٹا گھنگور
نین دھلے آئینے جن سے جھانکے من کا چور
چال شرابی، لب عنّابی، چاندی ایسے دانت
بات کرے تو پھول کھلیں اور ہنسے تو جاگے بھور
ٹخنے ٹخنے پانی میں جیوں دھان جھکورے کھائے
دھرتی پر جب چلے تو لاگے ناچے کوئی مور

چھم چھم کرتی برکھا آئے، اَنگ اَنگ نہلائے
پَون بدن کو چومے پل پل، چھن چھن واری جائے
جیسے 'نذرل' کا کوئی نغمہ 'زین' کوئی شہکار
جیسے کسی مانجھی کا سپنا مورت میں ڈھل جائے

(۲)

گیہوں جیسا رنگ سنہرا، گھنے گھنے گیسو
پیراہن میں رچی بسی سی تن من کی خوشبو
قامت جیسے ہری بھری سی کوئی لچکتی ڈال
ہونٹ رسیلے، نین نشیلے، چال رمِ آہو
چلے تو چاروں اور ہزاروں آئینے چمکیں
ٹھہرے تو اِک خنک اُجالا چھا جائے ہر سو

راوی اور چناب میں دُھل کر رنگ نکھرتا جائے
کھیتوں کھلیانوں میں تپ کر روپ سنورتا جائے
دیکھو تو اِک نار ہے لیکن سوچو تو جانو
'وارث شاہ' کی 'ہیر' سناتا وقت گزرتا جائے

(۳)

چاندی ایسا رنگ روپہلا، گھونگھریالے بال
آبِ رواں کی طرح سبک اور نرم نشیلی چال
آنکھیں جیسے مدھ کے پیالے، کھلتی کلی سے ہونٹ
چہرے کے ہر خط سے نمایاں، دل کا چھپا احوال
پیروں اور وڈیروں کی ٹھوکر میں عمر بِتائے
پھٹے ہوئے دامن میں سمیٹے جیون کا جنجال

سندھو کی موجوں کی طرح جیون سنگیت سنائے
طوفانوں کی زد میں رہ کر من کا دیپ جلائے
جیسے آدھی رات گئے کوئی 'اکتارہ' چھیڑے
جیسے کوئی 'شاہ لطیف' کی 'کافی' گاتا جائے

(مطبوعہ 'ندیم' ڈھاکہ مارچ، ۱۹۶۰ء)

یارِ کج ادا

کیوں مجھ سے بدگماں ہو اے میرے یار صوفی
رہتے ہو اِس طرح کیوں بیگانہ وار صوفی
تم کو تو میں نے ہر دم دل سے قریب جانا
اپنا رفیق سمجھا، اپنا حبیب جانا
اپنی طرح تمہیں بھی گھائل غریب جانا
اِس ملک کا تمہیں بھی ایسا ادیب جانا
میری طرح ہے جس کا دل داغ دار صوفی

تم کیا ہو، کون ہو تم، اس سے غرض نہیں ہے
مجھ رہ نشیں کی دنیا تو اور ہی کہیں ہے
میری نگاہ میں تو اِک شاعر حسیں ہے
جس کا جہاں الگ ہے، جس کی الگ زمیں ہے
جو اپنی مملکت کا ہے شہریار صوفی

یہ کشمکش کی دنیا، سود و زیاں کی دنیا
عقل و جنوں کی مظہر، وہم و گماں کی دنیا
یہ مہربان صورت، نا مہرباں کی دنیا
اے کاش جانتے تم مجھ خستہ جاں کی دنیا
رہتا ہوں کس لیے میں یوں سوگوار صوفی

دنیائے دوں میں ہر سو پست و بلند بھی ہیں
خوار و زبوں بھی کچھ ہیں، کچھ ارجمند بھی ہیں
کچھ ایسے لوگ ہیں جو ایذا پسند بھی ہیں
لیکن ہزار ہا ہیں جو درد مند بھی ہیں
اور ہم سے بھی ہیں کتنے سینہ فگار صوفی

کیا جانے کس بنا پر تم نے کیا کنارا
میرا سلام بھی اب تم کو نہیں گوارا
اُٹھتی نہیں نگاہیں میری طرف دوبارا
اتنا حقیر بھی تو سمجھو نہیں خدارا
میں بھی اِک آدمی ہوں، ہر چند خوار صوفی

روٹی کی بات کیا ہے، ملتی بھی ہے نہیں بھی
انساں گزار لیتا ہے زندگی کہیں بھی
دوزخ بھی ہے یہ دنیا اور جنت حسیں بھی
لیکن یہ بات تم تھے، اِک یار دلنشیں بھی
اور آج تم ہو 'افسر'، میں 'اہلکار' صوفی۔

۔ایک دوست کا فرضی نام

جون ۱۹۵۱ء سے فروری ۱۹۶۳ء تک میں ریڈیو پاکستان کراچی اور حیدرآباد میں بحیثیت 'اسٹاف آرٹسٹ' کام کرتا رہا۔ ملازمت کے دوران بعض ناخوشگوار دن ایسے بھی آجاتے ہیں کہ دو اچھے دوستوں میں تھوڑا سا فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نظم حیدرآباد کے ایک کچھ ایسے ہی دنوں کی یادگار ہے۔ (شاعر)

O

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اُٹھائے
جس کو ملی ہو زخمِ جگر کی شگفتگی

غزلیں

مرا ہر غم نہ کرنا اُس سے منسوب
زمانے میں ہزاروں مہرباں ہیں

O

تنہائی میں قریبِ رگِ جاں ترا خیال
وحشت میں ہے سکون کا عنواں ترا خیال

خاموشیوں میں دل کی ہے دھڑکن تری صدا
تاریکیوں میں سروِ چراغاں ترا خیال

غربت میں ہم سفر، ترا سایہ قدم قدم
مایوسیوں میں آس کا امکاں ترا خیال

شہرِ خرد میں تیرا تصور اِرم اِرم
دشتِ جنوں میں خوابِ گلستاں ترا خیال

پَرتو سے تیرے دھوپ میں بھی چاندنی کا رنگ
پت جھڑ کی رُت میں صبحِ بہاراں ترا خیال

جس طرح لفظ میں ہیں معانی چھپے ہوئے
یوں ہے مرے خیال میں پنہاں ترا خیال

عرفانِ حسن مجھ کو ہوا، تجھ کو دیکھ کر
کیا راز کر گیا ہے نمایاں ترا خیال

فکرِ رسا و دیدۂ بینا پہ کر گیا
اسرارِ مشتِ خاک، نمایاں ترا خیال

O

سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
کوئی محبوبِ نظر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

چاند کی طرح ستاروں میں جوانی گزرے
کہکشاں راہگزر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

عارض و لب کے چمن زار ہوں پہلو میں کھلے
ایسی ہر شب کی سحر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

گل کی آغوش میں سوئی ہوئی خوشبو کی طرح
زندگی اپنی بسر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

O

اُن کی جو راہ تھی وہ اُسی پر چلا کیے
ناداں تھے ہم، چلے جو انہیں رہنما کیے

گل چین و گل فروش کی سازش سے بے خبر
ہم اہتمامِ فصلِ بہاراں، کیا کیے

اب زحمتِ مزید اُٹھانے سے فائدہ
معلوم ہے جو آپ نے وعدے وفا کیے

اِک آفتاب تازہ کے سوزِ فراق میں
کتنے ستارے بجھ گئے، کتنے جلا کیے

وارفتگیٔ شوق بچا لے گئی ہمیں
ہر چند راستوں میں تماشے ہوا کیے

مطبوعہ 'مشرب' کراچی۔جنوری،۱۹۵۳ء

O

آج اے دل، لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
وقت کٹ جائے گا کچھ پیار کی باتیں ہی سہی

یوں تو کٹتی ہی رہے گی غمِ دوراں میں حیات
آج کی رات، غمِ یار کی باتیں ہی سہی

زندہ رہنے کی کبھی تو کوئی صورت نکلے
عالمِ عشرتِ دیدار کی باتیں ہی سہی

اب تو تنہائی کا یہ کرب نہ ہو گا برداشت
کچھ نہیں تو در و دیوار کی باتیں ہی سہی

کوئی تو بات چھڑے آج بہت جی ہے اُداس
حسرتِ کوچۂ دلدار کی باتیں ہی سہی

مطبوعہ 'مشرب' کراچی۔مئی،۱۹۵۵ء

O

نہ جانے اہلِ نشمین پہ کیا گھڑی آئی
قفس میں چیخ اُٹھا ہے سکوتِ تنہائی

چمن میں رہ کے مرا حال پوچھنے والو!
قفس میں صرف اندھیرا ہے اور تنہائی

نہ جانے بادِ صبا کہہ گئی مذاق میں کیا
کہ ہنستے ہنستے شگوفوں کی آنکھ بھر آئی

قدم قدم پہ کھلے ہیں ہزار لالہ و گل
جو کام آئی تو اپنی ہی آبلہ پائی

کوئی تو بات تھی، ہم کو ملا جو رتبۂ دار
وگرنہ شہر میں کچھ کم نہیں تھے سودائی

مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔ جون، ۱۹۵۵ء

O

اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
دور تک ہے نظروں میں دشتِ بے اماں یارو

اب نہ کوئی منزل ہے اور نہ رہگزر کوئی
جانے قافلہ بھٹکے، اب کہاں کہاں یارو

پھول ہیں کہ لاشیں ہیں، باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے، دار کا گماں، یارو

موت سے گزر کر یہ کیسی زندگی پائی
فکر پا بہ جولاں ہے، گنگ ہے زباں یارو

تربتوں کی شمعیں ہیں اور گہری خاموشی
جا رہے تھے کس جانب، آ گئے کہاں یارو

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو

صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غمِ محبت ہو کچھ غمِ جہاں یارو

وقت کا تقاضہ تو اور بھی ہے کچھ لیکن
کچھ نہیں تو ہو جاؤ، میرے ہم زباں یارو

ایک میں ہوں جس کو تم مانتے نہیں شاعر
اور ایک میں ہی ہوں، تم میں نکتہ داں یارو

مطبوعہ 'شاعر' بمبئی۔ جولائی، ۱۹۵۵ء

O

کیا کیا نہ زندگی کے فسانے رقم ہوئے
لیکن جو حاصلِ غمِ دل تھے وہ کم ہوئے

اے تشنگیء درد، کوئی غم، کوئی کرم
مدت گذر گئی ہے اِن آنکھوں کو نم ہوئے

ملنے کو ایک اذنِ تبسم تو مل گیا
کچھ دل ہی جانتا ہے جو دل پر ستم ہوئے

کس کو ہے یہ خبر کہ بہ عنوانِ زندگی
کس حسنِ اہتمام سے مصلوب ہم ہوئے

شاعر تمہیں پہ تنگ نہیں عرصۂ حیات
ہر اہلِ فن پہ دہر میں ایسے کرم ہوئے

مطبوعہ 'پگڈنڈی' امرتسر۔ ۱۹۵۵ء

O

کیوں ہو گئی اے شمع، تری بزمِ سخن چپ
دل چپ ہے،نظر چپ ہے،قلم چپ ہے،دہن چپ

نعرہ نہ سہی، چیخ سہی، کچھ تو ہو یارو!
بیٹھے ہیں بڑی دیر سے اربابِ وطن چپ

گل چیں ہے کہ گلشن کو کیے جاتا ہے تاراج
اور اہلِ چمن دیکھ رہے ہیں ہمہ تن چپ

جب موت ہی ٹھہری ہے تو اے دل یہ فغاں کیا
للکار کہ کر دیں نہ کہیں دار و رسن چپ

شاعر یہ عجب شور ہے، خاموش و پر اَسرار
دل میں تو ہے محشر سا مگر حرفِ سخن چپ

مطبوعہ ’جاوداں‘ لاہور۔۱۹۵۶ء

O

ایک سی ہے یوں تو کہہ لینے کو ہر اِک دل کی بات
اہلِ محفل سے الگ ہے، صاحبِ محفل کی بات

دوستو! طوفاں سے گھبرا کر نہ لو ساحل کا نام
لوٹتی موجوں سے پوچھو عشرتِ ساحل کی بات

اب تو یہ عالم ہے، ہم ہیں اور ہماری گمرہی
راستے کے پیچ و خم میں کھو گئی، منزل کی بات

کس سے دل کی بات کہیے، جس پہ پڑتی ہے نظر
اُس کا چہرہ بول اُٹھتا ہے، خود اپنے دل کی بات

جب بھی چھڑ جاتے ہیں شاعر الفتوں کے تذکرے
یاد آ جاتی ہے اپنے عشقِ لاحاصل کی بات

مطبوعہ ’راوی‘ لاہور۔فروری، ۱۹۵۷ء

O

کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دم ساز نہیں
اپنا غم کس سے کہوں کوئی بھی ہم راز نہیں

کھو گئی جانے کہاں، دل کے دھڑکنے کی صدا
میری آواز میں شامل تری آواز نہیں

ایسا لگتا ہے، کوئی محوِ سخن ہے مجھ سے
ہمہ تن گوش ہوں لیکن کوئی آواز نہیں

آشیاں اور قفس، ایک ہیں اب اپنے لیے
بال و پر ہوں بھی تو کیا، جرأتِ پرواز نہیں

کھائے جاتا ہے تمہیں کون سا غم اے شاعر
اب وہ جینے کا قرینہ نہیں، انداز نہیں

مطبوعہ 'مہر نیم روز' کراچی۔ مارچ، ۱۹۵۷ء

O

دل سے جو ترے غم کے پرستار نہ ہوتے
اِس شان سے رسوا سرِ بازار نہ ہوتے

سینے میں جو دل بن کے دھڑکتا نہ غمِ عشق
ہم اہلِ جنوں آج سرِدار نہ ہوتے

جینا بھی اِک الزام ہے، مرنا بھی اِک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فنکار نہ ہوتے

چلتے نہ اگر ہٹ کے زمانے کی روش سے
اربابِ جہاں، درپئے آزار نہ ہوتے

ہر بت کو خدا کہتے اگر ہم بھی تو یارو
کچھ ہوتے مگر شاعرِ نادار نہ ہوتے

مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔ جولائی، ۱۹۵۸ء

O

زخم کو پھول، حقیقت کو گماں کہتے ہیں
لوگ ہر بات سرِ بزم کہاں کہتے ہیں

شاخِ گل ہے کہ کسی لاش کا سوکھا ہوا ہاتھ
یہ بہاراں ہے تو پھر کس کو خزاں کہتے ہیں

ہے یہ ویرانہ، یہاں پاؤں سنبھل کر رکھنا
کبھی آباد تھا اِک شہر یہاں کہتے ہیں

تم میں اور ہم میں یہی فرق ہے دنیا والو
ہم ہر اِک بات سرِ بزمِ جہاں کہتے ہیں

ظرف کی بات ہے، اِک جام کی خاطر کچھ لوگ
دُزدِ میخانہ کو بھی پیرِ مغاں کہتے ہیں

مطبوعہ 'شاہراہ' دہلی۔ جنوری، ۱۹۵۹ء

O

یہ شہرِ رفیقاں ہے، دلِ زار، سنبھل کے
ملتے ہیں یہاں لوگ بہت روپ بدل کے

چہرے ہیں کہ مرجھائے ہوئے پھول کنول کے
آنکھیں ہیں کہ جھلسے ہوئے خوابوں کے محلکے

فرہاد سرِدار ہے، شیریں سرِ بازار
بدلے نہیں اب تک مگر انداز غزل کے

آئے ہیں غمِ عشق میں ایسے بھی مقامات
دل خون ہوا، آنکھ سے آنسو بھی نہ ڈھلکے

دنیا بھی اِک آماجگہِ حسن ہے شاعر
دیکھو تو کبھی خلوتِ جاناں سے نکل کے

مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔ فروری، ۱۹۶۰ء

O

اب تو ہر شورِ طرب سن کر دہل جاتا ہے دل
جانے کس اندیشۂ فردا سے گھبراتا ہے دل

جب بھی ملتے ہیں کہیں دو دل بہت ہی پیار سے
مسکرا اُٹھتی ہیں آنکھیں اور بھر آتا ہے دل

تم اِسے دیوانگی سمجھو کہ نادانی کہو
ٹوٹ کر بھی پھر اُسی پتھر کے گُن گاتا ہے دل

پھر نہ لٹ جائیں کہیں منزل پہ اہلِ کارواں
اُٹھتے جاتے ہیں قدم اور بیٹھتا جاتا ہے دل

شاعر ایسی چوٹ کھائی ہے بہ فیضِ دوستاں
دوستی کے نام ہی سے اب لرز جاتا ہے دل

مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔ اگست، ۱۹۶۰ء

O

رہنِ غم و آلام کیے جاتا ہے مجھ کو
کیا شغل ترا عشق دیے جاتا ہے مجھ کو

معلوم نہیں کون سی راہوں پہ رواں ہوں
دل جانے کدھر آج لیے جاتا ہے مجھ کو

سناٹے میں رہ رہ کے دھڑک اٹھتا ہے یوں دل
جیسے کوئی آواز دیے جاتا ہے مجھ کو

پہلے تو میں پی جاتا تھا ہر غم کو بہ یک جام
اب غم ہے کہ ہر لمحہ پیے جاتا ہے مجھ کو

کیوں خوف زدہ اتنا ہے مجھ سے کہ زمانہ
سینے میں مرے دفن کیے جاتا ہے مجھ کو

مطبوعہ 'خیال' کامٹی۔ جون، جولائی، ۱۹۶۰ء

O

اُس سے ملنے کی آس کیا شاعر
رہ گیا تیرے پاس کیا شاعر

اُس سے اظہار حال کیا کیجے
وہ نہیں غم شناس کیا شاعر

غم ہے زندہ تو دل بھی زندہ ہے
غم نہیں ہے تو آس کیا شاعر

جلتے بجھتے چراغ کیا معنی
یہ اُمید اور یاس کیا شاعر

ہنستے رہتے ہو بے سبب اکثر
عشق آیا ہے راس کیا شاعر

O

یوں موت کو حیات کا انعام کر لیا
جو بھی کفن ملا، اُسے احرام کر لیا

دن ڈھل گیا تو ہم نے بہ فیضِ فروغِ مئے
خورشید اِک طلوع سرِ شام کر لیا

آزاد ہو کے اور بھی پابند ہو گئے
ایسے اُڑے کہ خود کو تہہِ دام کر لیا

اُس آہوئے رمیدہ کی وحشت تھی دیدنی
یہ کیا کیا کہ میں نے اُسے رام کر لیا

اب تیرے ذکر ہی سے عبارت ہے زندگی
ہر اِک نفس کو میں نے ترا نام کر لیا

O

مدت سے یونہی شام و سحر جاگ رہے ہیں
کس آس میں یہ شمس و قمر جاگ رہے ہیں

شب ہے کہ ڈھلے جاتی ہے اور ہم تری خاطر
بیٹھے ہیں سرِ راہگذر جاگ رہے ہیں

سینے میں چھپائے ہوئے اِک آتشِ خاموش
ہم کب سے بہ ایں دیدۂ تر جاگ رہے ہیں

اِک شعلۂ مثبت کی طرح سرکش و بے فکر
مقتل میں بھی بے خوف و خطر جاگ رہے ہیں

دنیا کے بدلتے ہوئے حالات ہیں شاہد
دنیا میں ابھی اہلِ نظر جاگ رہے ہیں

O

رات کٹ جائے کسی طرح تو بس
ایک اِک لمحہ ہے ایک ایک برس

روح اور جسم میں ہے جنگ کڑی
ٹوٹ جائے نہ کہیں تارِ نفس

ایسے جینے سے بھلا کیا حاصل
زیست میں رنگ ہی باقی ہے نہ رس

اِک ذرا جرأت پرواز کہ آج
سو گئے تھک کے نگہبانِ قفس

خامشی بول رہی ہو جیسے
دل کی دھڑکن ہے کہ آواز جرس

O

اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر سب سو گئے
سب کو بیداری کا دعویٰ تھا، مگر سب سو گئے

صبح کی خاطر رہے جو رات بھر مشعل بکف
ایسی نیند آئی کہ ہنگامِ سحر، سب سو گئے

اِس کو کیا کہیے کہ احساسِ زیاں کے باوجود
راہ میں کیا راہرو، کیا راہبر سب سو گئے

کارواں خطرے میں ہے، کچھ دیر میں ہی جاگ لوں
کون اِس کا پاسباں ہو گا، اگر، سب سو گئے

اِس سفر میں رہزنوں کا خوف پہلے ہی سے تھا
لاکھ چِلّاتا رہا شاعر مگر سب سو گئے

O

موت سے اے دل ڈرتے کب ہیں
موت سے پہلے مرتے کب ہیں

موت ہے ہستی کی اِک منزل
ہر منزل پہ ٹھہرتے کب ہیں

اِس دنیا سے گزر کر بھی ہم
اِس دنیا سے گزرتے کب ہیں

اپنی ہوا میں اُڑنے والے
پاؤں زمیں پہ دھرتے کب ہیں

جتنی جلد بکھر جاتے ہیں
اتنی جلد سنورتے کب ہیں

O

بجا کہ اپنی دسترس میں لوح بھی، قلم بھی ہے
مگر جو کھل کے دل کی بات کہہ سکے وہ دم بھی ہے؟

سحر کو میں شکستِ شب سمجھ تو لوں، مگر یہ کیا
جو پھول مسکرا رہے ہیں اُن کی آنکھ، نم بھی ہے

بجا کہ میں نے دیر کو مقامِ کعبہ دے دیا
حرم جسے سمجھ رہے ہیں آپ، وہ حرم بھی ہے؟

وہ جس کی دوستی پہ خندہ زن ہے دل کا زخم زخم
نصیبِ دشمناں کہ آج وہ شریکِ غم بھی ہے

وطن میں میرؔ کی طرح اگر ہیں خوار ہم تو کیا
ادب میں میرؔ سے زیادہ کوئی محترم بھی ہے؟

O

میں جو کچھ سوچتا ہوں اب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا
جو ہو گا زندگی کا ڈھب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

ابھی تو آنکھ اُوجھل ہے مگر خورشید کے ہاتھوں
کھنچے گی جب ردائے شب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

مقدر میں تمہارے کیوں نہیں لکھاّ، بجز میرے
صلیب و دار کا منصب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

یہ کیسا قافلہ ہے جس میں سارے لوگ تنہا ہیں
یہ کس برزخ میں ہیں ہم سب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

خدا اور آدمی دونوں اگر عینِ حقیقت ہیں
حقیقت میں ہے کیا مذہب تمہیں بھی سوچنا ہو گا

نظمیں

حقیقتیں تو ہزاروں ہیں تشنۂ اظہار
مگر وہ ایک حقیقت جو میرے لب پر ہے
جو اشک اشک کہیں ہے تو زخم زخم کہیں
وطن کے قرض کی صورت مرے ادب پر ہے

شہکار

○(چندمنٹ عابدروڈ پر)

ازل کے مصور کے شہکار ہیں یہ

یہ مدقوق و مفلوج و معذور انساں
یہ مظلوم و محکوم و مجبور انساں

یہ پروردۂ بطنِ جاگیرداری
گرفتارِ حالات، ننگے بھکاری

یہ رام اور سیتا کا دم بھرنے والے
محمدؐ کی امت، خدیجہ کے بالے

خداؤں کے پرماتماؤں کے مارے
دکاں دارِ دیں، پارساؤں کے مارے

یتیمانِ علم و ہنر، راہزادے
تہی دست، کاسہ بکف شاہزادے

نہ ماں اِن کی کوئی، نہ باپ اِن کا کوئی
نہ نردوش ہیں یہ، نہ پاپ اِن کا کوئی

مقدر کی ہر آن جپتے ہیں مالا
اندھیرے کو سمجھے ہوئے ہیں اُجالا

برہنہ ہیں، بھوکے ہیں، لاچار ہیں یہ
ازل کے مصور کے شہکار ہیں یہ

○ حیدرآباد دکن کی ایک مشہور سڑک

○ مطبوعہ ہفتہ وار 'شاہد' بمبئی۔ ۱۱ جولائی، ۱۹۴۸ء

ملامت

(مہاتما گاندھی کی برسی پر)

وہ شمع جو پروانوں کے لیے محفل میں جلی
اُس شمع کو پروانوں نے خود ہی پھونک دیا
وہ آگ جو شعلۂ خوں بن کے ہر دل میں جلی
وہ آگ وہ شعلۂ خوں آخر اشکوں میں ڈھلا

اب بیٹھ کے سب روتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں
مٹی میں ملے اشکوں کے موتی چنتے ہیں

مہاتما گاندھی کو ناتھورام گوڈسے نے ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو گولی ماردی تھی۔ (شاعر)

ایک منظر

(تخیل۔حقیقت اور ایک روایتی شاعر)

چودھویں کا چاند ہے یا حسنِ کافر بے نقاب
خاک کے ذرّے ہیں یا انوار کے روشن حباب
چاندنی چھٹکی ہے یا گردوں سے گرتی ہے شراب
تنکے تنکے پر جوانی ذرّے ذرّے پر شباب

ہائے کیا پرکیف منظر ہے یہ، کیا پرنور رات
ڈھل رہی ہے حسن کے سانچے میں جیسے کائنات
اے غم دل دور ہو، جاگی تمنائے حیات
ہو گئے پھر سے حسیں میری نظر میں شش جہات

کون کہتا ہے کہ یہ دنیا ہے اِک دارالمحن
آدمی پہنے ہوئے ہے زندگی ہی میں کفن
مفلسوں کے بِک رہے ہیں کوڑی کوڑی میں بدن
من کی دنیا مر چکی ہے، آج کل زندہ ہے دھن

کر رہا ہے کارِ عزائیل بھی انسان ہی
خندہ زن ہے موت ہرسو، رو رہی ہے زندگی

O

اُف! مگر یہ کس طرف سے چیخ کی آئی صدا
دل دہل کر رہ گیا، سارا بدن تھرّا اٹھا
میری آنکھوں میں اندھیرا کیوں ہے؟ آخر کیا ہوا؟
عیش وعشرت کی گھڑی میں کس کا گھر لوٹا گیا

پیچ و خم کھاتا ہوا یہ سیل خوں کیسے یہاں
تازہ تازہ گرم گرم اُف! اے خدا جاؤں کہاں!

چارسُو ہے خون ہی خوں، کربلا کا سا سماں
چھوٹ جا اے نبضِ ہستی، ٹوٹ پڑ اے آسماں

کتنی لاشیں، کتنے انساں خون سے رنگیں بدن
بے کفن، بے گور، سیل خون میں ہیں غوطہ زن
زندگی کو زندگی کہتا تھا ہر دم میرا من
شہر کی گلیوں ہی میں تو موت ہے جلوہ فگن

زندگی ہر موڑ پر انسانیت کو کھو چکی
آدمیت، شیطنت کے غار میں گم ہو چکی

O

پیچ وخم کھاتے ہوئے اِس سیل خوں کو کیا کہوں؟
شاعرِ رنگیں نوا ہوں، کون سی تشبیہ دوں؟
عارض گلگوں کہ چشمِ یار کے ڈورے کہوں؟
عہدِ رفتہ کا ہوں شاعر، شاعری ہی چھوڑ دوں

عہدِ نو میں بوالہوس شاعر کی چل سکتی نہیں
زندگی نازک مزاجوں سے بدل سکتی نہیں
آفتیں ہیں جو سروں پر، ایسے ٹل سکتی نہیں
دھیمی دھیمی آنچ سے زنجیر گل سکتی نہیں

ایک نعرہ، ایک شعلہ، ایک ضربِ مؤسوی
شاعری کہیے جسے، 'جزویست از پیغمبری'

مطبوعہ ہفتہ وار 'شاہد' بمبئی۔ ۱۳ اپریل، ۱۹۴۹ء

فسادات کی ایک رات

یہ بھیانک تیرگی، پُرہول رات
سہمی سہمی سی ستاروں کی برات
دم بخود، خاموش، ساری کائنات

راستے ملبوں سے پُر، سنسان، چپ
شہر جیسے کوئی قبرستان، چپ
تک رہا ہے آسماں حیران، چپ

یہ ہوا ہے یا کسی کی سسکیاں
کس پہ کیا بیتی کسی کو کیا گماں
تیرگی میں گم ہے آہوں کا دھواں

کس کو ہو گی آج خود اپنی خبر
کوئی رہرو ہے نہ کوئی راہبر
بہکی بہکی سی ہر اِک فکر و نظر

سوچتا ہوں، سوچ پر قابو نہیں
رو رہا ہوں، آنکھ میں آنسو نہیں
زندگی ہے، زیست کی خوشبو نہیں

سہمی سہمی، رینگتے چلتی ہواؤ
ڈھونڈھتی ہو کس کو تم، کچھ تو بتاؤ
کچھ نہیں ہے اب یہاں پر، لوٹ جاؤ

تم کو ہے جس خوابِ فردا کی تلاش
ایسا ہر اِک خواب ہے اب پاش پاش
وہ پڑی ہے اُس کی جھلسی جھلسی لاش

(۱۹۴۹ء)

تلنگانہ

(آندھراپردیش)

یہ سرخ دھرتی جو آج تپ تپ کے سرخ انگارہ بن گئی ہے
اسی سے پھوٹے ہیں وہ شرارے جو خرمنِ زر جلا رہے ہیں
ہزار 'بادل' گرج رہے ہیں ہزار 'بجلی' کڑک رہی ہے
ہزار 'طوفان' اٹھ رہے ہیں مگر یہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں

نہ فکرِ امروز ہے انہیں اور نہ یادِ ماضی ستا رہی ہے
نظر میں مستقبلِ درخشاں کی ضو ہے جو رہ دکھا رہی ہے

یہ نظم ہفتہ وار 'شاہد' بمبئی میں یکم مئی ۱۹۴۹ء کو 'نردوش'۔۔۔میرے قلمی نام سے شائع ہوئی تھی۔(شاعر)

ایشیا

آخرش جاگ اُٹھا وقت کا خوابیدہ شعور
شب کے پروردہ اندھیروں کا فسوں ٹوٹ گیا
اِک کرن پھوٹ کے چمکا گئی مشرق کا نصیب
دستِ اوہام سے ہر دامنِ دل چھوٹ گیا

کل تلک سرد تھی جن ذروں کے احساس کی آگ
آج تپ تپ کے وہ خورشید ہوئے جاتے ہیں
جن کو روندا گیا صدیوں وہی مجبور عوام
انقلابات کی تمہید ہوئے جاتے ہیں

لاکھ پھینکے شبِ تاریک سویرے پہ کمند
کارواں صبح کا بڑھتا ہی چلا جائے گا
اپنے ہمراہ لیے سینکڑوں کرنوں کا جلوس
وسعتِ عالم آفاق پہ چھا جائے گا

اشاعت اول بعنوان 'بیداری' ہفتہ وار 'شاہد' بمبئی۔۲۲ مئی، ۱۹۴۹ء

کوجے

(شمالی کوریا کے پاس ایک جزیرہ)

سنو یہ کس ماں کی چیخ ہے جو حصارِ زنداں سے پھوٹتی ہے
یہ کس بہن کی کراہ ہے جو لبوں تک آ آ کے ٹوٹتی ہے
یہ کس کی دلدوز ہچکیاں ہیں، یہ کس کی سانس آج چھوٹتی ہے

یہ کون بھائی ہے جس کی للکار سے ہر اِک دل دہل رہا ہے
یہ آج کوجے میں کس کی ناموس کا جنازہ نکل رہا ہے

یہ ایشیا کی حسین بستی ہے یا کہ ڈالر کا کارخانہ
ہماری اپنی زمین ہے یا کہ سامراجی قمارخانہ
ہماری تہذیب کا ہے مامن کہ قحبگی کا نگار خانہ

جو تاب نظارہ ہو تو دل میں گڑے ہوئے کارتوس دیکھو
سڑک سڑک پر برہنہ ماؤں کا، بیٹیوں کا جلوس دیکھو

جشنِ آزادی

ناچو گاؤ دھوم مچاؤ
آزادی کا جشن مناؤ

مت سوچو اے بھولے لوگو
کیا کچھ بیتی کنجِ قفس میں
جیون کاٹ رہے ہو اب بھی
اپنے گھر میں یا محبس میں

دل کی بات زبان پر لا کر آزادی پر حرف نہ لاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

ہم اُس قوم کے لختِ جگر ہیں
جس کا ہم سر کوئی نہیں ہے
ساری دنیا اپنا وطن ہے
اپنا گھر در کوئی نہیں ہے
دنیا مانے یا نا مانے اپنی عظمت کے گن گاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

بچوں کی ہر بات نہ مانو
بچے ضدّی ہو جاتے ہیں
روتے ہیں تو رو لینے دو
روتے روتے سو جاتے ہیں
راہنماؤں کے گن گا کر بھوکے بچوں کو بہلاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

گرد و پیش کی بات نہ چھیڑو
ایسی بات سے جی جلتا ہے

اپنا ملک ہے سب سے نیارا
اپنے ملک میں سب چلتا ہے
اوروں سے کیا لینا تم کو، تم کیوں اوروں کا غم کھاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

یہ دنیا دو روز کی دنیا
اِس میں اُلجھ کر کیا کر لو گے
راز کے اندر، راز نہاں ہے
سوچ سمجھ کر کیا کر لو گے
اصلی دنیا اور کہیں ہے اُس دنیا کی دُھن اپناؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

اُونچ اور نیچ کی ساری باتیں
عقل کی چالیں، علم کی گھاتیں
سب کچھ ہے تقدیر کے بس میں
کس کے دن اور کس کی راتیں

جس کا بھید وہی جانے ہے تم کیوں اپنا دھرم گنواؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

بھوک لگے تو روٹی کھا لو
پیاس لگے تو پانی پی لو
اور اگر یہ بھی نہ ملے تو
رب سے آس لگا کر جی لو
خلدِ بریں کے خواب سجا کر اپنی قبروں میں سو جاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

غم جب حد سے سوا ہوتا ہے
سنتے ہیں کہ دوا ہوتا ہے
درد کو حد سے بڑھ جانے دو
صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے
کل جو ہوگا، کل دیکھیں گے، کل کی بات نہ چھیڑو، آؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

○ یہ نظم 'ابن مریم' کے نام سے ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء کو ہفت روزہ 'لعل و نہار' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔

زندگی اور پتھر

(اجنتا جانے کے لیے میرے آبائی شہر اورنگ آباد سے ہو کر جانا پڑتا ہے
جو 'ریاست حیدرآباد دکن' کا دوسرا بڑا شہر تھا)

اجنتا کا نظارہ کرنے والو
اِدھر بھی اِک نگاہِ طائرانہ
صنم خانے یہاں بھی کچھ ملیں گے
ذرا ذوقِ تجسس آزمانا

یہ شاہوں اور راجاؤں کی بستی
گناہوں کی کمیں گاہِ مقدس
محل زادوں کے حق میں خلد ساماں
رعایا کے لیے تاریک محبس

ہزاروں سال سے اِس سر زمیں پر
مرے جمہور کی دنیا ہے ویراں
ہزاروں انقلابات آئے لیکن
شہنشاہی کی جنت ہے گل افشاں

یہی جنت، یہی تاریک محبس
مرے پھولوں کا خاروں کا وطن ہے
سحر دم جن کو کفنایا گیا ہے
یہ اُن خورشید پاروں کا وطن ہے

یہ گرد آلود کچّے راستوں پر
شکستہ جھونپڑے، گرتے ہوئے کھم
کسی بوڑھے کی آنکھوں کی طرح، چپ
کسی بیوہ کے دامن کی طرح، نم

سرِ بازار چلتی پھرتی لاشیں
جہالت، بھوک، بیماری کے بیٹے

گزرتے ہیں رہِ شام و سحر سے
دریدہ دامنِ ہستی سمیٹے

جوانی کی سحرگوں مسکراہٹ
لبوں کی قبر میں سوئی ہوئی ہے
نظر شمس و قمر کی تابناکی
خلاؤں میں کہیں کھوئی ہوئی ہے

یہ انساں، ہند کے آزاد انساں
جھکے شانے، فسردہ رخ، نظر چپ
سنائیں کس کو آہوں کا فسانہ
خدا چپ، ناخدا چپ، بحر و بر چپ

اجنتا کا نظارہ کرنے والو
اجنتا کے بتوں میں کیا رکھا ہے
اجنتا، پتھروں کی زندگانی
یہ بستی زندگی کا بت کدہ ہے

مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔ اکتوبر، ۱۹۵۱ء

چاندنی سے سویرے تک

روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
سالہا سال سے ڈھلتے ہوئے خورشید کا نور
رات کے ماتھے پہ بنتا رہا زرّین سا جال
لیکن اب تک نہ ہوئی رات سحر رنگ کبھی
چاندنی پا نہ سکی صبح کا دوشیزہ جمال

روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
اب بھی ڈھلتے ہوئے سورج کا سسکتا ہوا نور
رات کے ماتھے پہ پھیلا ہے اُفق تابہ اُفق
لیکن اس کوششِ ناکام سے حاصل کیا ہے
جس کی بنیاد میں ترتیب نہ وسعت نہ عمق

روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
پھیر کر رخ شبِ کشکول بکف سے اپنا
اب سحر دوست کہیں اور نظر رکھتے ہیں
چاندنی گرچہ دیے جاتی ہے ہر گام فریب
اپنی منزل کی بہ ہر گام خبر رکھتے ہیں

کل تلک ڈوبتا سورج تھا چراغِ محفل
آج اُبھرتا ہوا خورشید ہے ان کی منزل

(۱۹۵۰ء)

کہکشاں

ہزاروں برس سے فضائے جہاں پر اندھیرے ہیں اپنا تسلط جمائے
مگر آج تک وہ جیالے ستاروں کی تابندگی چھین لینے نہ پائے

ستاروں کی تابندگی چھین لینے کی خاطر اندھیروں نے سوروپ دھارے
کبھی اُن پہ ابرِ سیہ بن کے چھائے، کبھی اُن کی محفل میں مہتاب اُتارے
کبھی رات کو صبح کا روپ دے کر مسلسل دکھاوے کے سورج اُبھارے
کبھی اُن کے مسکن پہ بجلی گرائی، کبھی اُن پہ برسائے اپنے شرارے

ہزاروں برس سے ستارے اِسی طرح ظلمت کے ظلم وستم سہتے آئے
مگر آج تک ان اُجالے کے پیغمبروں کے قدم ڈگمگانے نہ پائے

(۱۹۵۰ء)

بھجن

ڈالر دیس کے راجہ او سب راجوں کے رکھوالے
کٹھن گھڑی ہے ہم بھگتوں پر، آ کر ہمیں بچا لے
او سب راجوں کے رکھوالے

آج ہمارے دیس میں ہمری جان کے پڑ گئے لالے
چار طرف سے اُمڈ پڑے ہیں لال پھریرے والے
تیرے بنا اب کون بھلا اِس آئی بلا کو ٹالے
سب کچھ تیرے حوالے
او، سب راجوں کے رکھوالے

بھارت میں ہر گاؤں کی جنتا ہم کو آنکھیں دکھائے
لاکھ جتن کر بیٹھے لیکن پھر بھی منہ کی کھائے
سورگ کا لالچ، نرکھ کی دھمکی، کچھ بھی کام نہ آئے
لٹتی آن بچا لے
او، سب راجوں کے رکھوالے

(کوریا پر امریکہ کے حملے کے بعد جنوری ۱۹۵۱ء کو بمبئی میں یہ بھجن IPTA (انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن) کے اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔ یوں کہ ایک پردے پر جنگ کی تباہ کاریاں دکھائی گئی تھیں۔ سامنے ڈالروں کے ڈھیر پر امریکہ کے صدر ٹرومن کی مورتی اپنے کئی ہاتھوں میں جنگی ہتھیار لیے کھڑی کی گئی اور اس کے اطراف بیٹھے امریکہ کے 'پٹھو حکمرانوں' نے اپنے مخصوص لباس پہن کر یہ بھجن گایا۔ اس بھجن کی دھن موسیقار پریم دھون نے بنائی تھی اور اُوشا جی نے اسے پیش کیا تھا)

O

'تاجر' کا دیں ہے ایک، برہمن ہو یا کہ شیخ
لیکن یہ راز سب پہ کہاں منکشف ہوا

شکستِ خواب

کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی

دیواروں کی رنگت فق، دروازوں پہ چپ طاری
مبہوت سی خاموشی، گم سم سی فضا ساری
ہر دل پہ گراں دھڑکن، ہر روح پہ تن بھاری
کعبہ ہو کہ بت خانہ، پتھر کی عمل داری

کیا چشم و لب عارض، کیا زلف، جبیں، شانے
سب اپنے تضادوں کے منہ بولتے افسانے
دم توڑتے جاتے ہیں جلتے ہوئے پروانے
اور شمع نہیں جانے، اپنے ہیں کہ بیگانے

ہے اہلِ ہنر کی یہ کیا خوب ہنر کاری
جاگی ہوئی آنکھیں ہیں، سوئی ہوئی بیداری
ساقی ہے تو ساقی کی نظروں میں وہ پُرکاری
ہر رند تہی ساغر اور فیضِ کرم جاری

جس سمت نظر کیجے اِک عالمِ حیرانی
یا زیست کی ویرانی یا موت کی ارزانی
نے زہدِ شراب آگیں نے کفرِ مسلمانی
کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی

(۱۹۵۱ء)

○ یہ نظم دوسرے ایڈیشن میں 'پچھتاوا' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ (شاعر)

○

آنکھ کھلی تو پلکیں نم تھیں
دیکھ لیں خوابوں کی تعبیریں

نیا عہد نامہ

معاف کر دو مرے وطن کے عظیم لوگو
کہ میں نے تم سے عجب گھڑی بے وفائی کی ہے
تم آج اپنی صفوں کو ترتیب دے رہے ہو
اور آج میرے غرور نے جبہ سائی کی ہے

میں اپنی دنیا سے دور اِک دوسری زمیں پر
خود اپنے ہاتھوں ہی اپنی تحقیر کر رہا ہوں میں
بہ فیضِ افلاس، چند نانِ جویں کی خاطر
میں اپنی تربت کی آپ تعمیر کر رہا ہوں

ہزاروں آہوں کے، آنسوؤں کے خموش نالے
مرے عزائم پہ آج آوازہ کس رہے ہیں
میں لاکھ ہنس ہنس کے دے رہا ہوں فریب خود کو
مگر مری روح کو سنپولے سے ڈس رہے ہیں

کچو کے دیتا ہے ہر نفس کوئی دل کے اندر
کوئی مسلسل لہو میں زہراب گھولتا ہے
تڑپ کے یک لخت چیخ اٹھتی ہے روحِ مضطر
کوئی کچھ ایسے ضمیر کی فصد کھولتا ہے

میں اپنے ہونٹوں کی قبر پر مسکراہٹوں کے
حسیں پھولوں کی چادریں کب تلک چڑھاؤں
میں خود کو اور اپنے پیش و پس کو فریب دینے
بجھی سی شمعِ نظر کی لو کب تلک بڑھاؤں

نہیں نہیں میں فریب خود کو نہ دے سکوں گا
یہ زہر قطرہ بہ قطرہ اب میں نہ پی سکوں گا
میں اپنے پھولوں کو چند خاروں کی نذر کر کے
حیات کا دامنِ دریدہ نہ سی سکوں گا

میں دور رہ کر بھی تم سے نزدیک ہوں رفیقو!
تمہارے بے تاب دل کی دھڑکن کو سن رہا ہوں

تمہاری آنکھوں میں جاگتا ہے جو خوابِ فردا
میں اُس کی تعبیر کے حسیں پھول چن رہا ہوں

میں جانتا ہوں جو ظلمتیں آج پھن اُٹھائے
تمہاری دھرتی کے نونہالوں کو ڈس رہی ہیں
وہی بہ اندازِ دیگر اِس سر زمین پر بھی
مرے حسیں شبنمی اُجالوں کو ڈس رہی ہیں

یہاں بھی انسان کا وقار اِک حقیر شے ہے
جو چند سکوں کے مول کانٹوں پہ تل رہا ہے
یہاں بھی تاریخ اپنا چولا بدل رہی ہے
خدائی کا، ناخدائی کا پول کھل رہا ہے

حسیں لفظوں کی اوٹ سے جھانکتی حقیقت
شعور کی سر بہ مُہر خبریں اُڑا رہی ہے
حرم کے محراب کے چراغوں کی اُونگھتی لو
خود اپنے انجام کا فسانہ سنا رہی ہے

عوام کے شب گزیدہ خوابوں کے سرد اُفق کو
اُبھرتا خورشید اپنی کرنوں سے دھو رہا ہے
عقیدتوں کے سیاہ محبس میں دھیرے دھیرے
حقیقتوں کا شعور بیدار ہو رہا ہے

میں عہد کرتا ہوں میرے خوابوں کے پاسبانو
میں راہِ حق میں ہمیشہ پرچم بکف رہوں گا
میں اپنے جمہور کے قدم سے قدم ملائے
تمہاری جہدِ حیات میں صف بہ صف رہوں گا

(۱۹۵۱ء)

O

تھے باغباں کے روپ میں گل چیں جگہ جگہ
آئی جو اب بہار تو اُٹھنے لگے نقاب

نیپیر روڈ۔

نیپیر روڈ پہ تحدید، بہت خوب مگر
نیپیر روڈ پہ تحدید کا آخر انجام!
چلتے پھرتے ہوئے کعبوں سے اُٹھاؤ تو غلاف
نیپیر روڈ رواں ہے کہ نہیں گام بہ گام
جہل زندہ ہے تو رسوا ہی رہے گی تہذیب
بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام

(۱۹۵۲ء)

۔طوائفوں کا محلّہ

پھر یومِ بہار آیا

ہاں یہی ہے مری فردوس زمیں
میرے خوابوں کی سنہری تعبیر
میرا انعام، مرا حاصلِ جہد
میری گم گشتہ سحر کی تنویر
میرے ناکردہ گنہ کی تعزیر

ہاں، اِسی خندۂ نم کی خاطر
میں کہ پیتا رہا برسوں آنسو
اِسی جنت کو سجانے کے لیے
اپنی رگ رگ سے نچوڑا تھا لہو
اپنے گلشن کی لٹا دی خوشبو

کتنی دلکش ہے یہ تصویرِ بہار
ایک اِک نقش ہے ایک اِک شہکار
یہ ہر اِک گام پہ تا حدِ نظر
میرے خس پوش محلکوں کی قطار
سانس لیتی ہوئی لاشوں کے مزار

کوچہ و راہ میں بکھرے ہوئے پھول
زندگانی کے نئے نقش و نگار
گرد آلود، برہنہ، بھوکے
ناتواں، کالے کلوٹے، بیمار
میرے آزاد وطن کے معمار

جگمگاتے ہوئے بازاروں میں
خم لنڈھاتے ہوئے کعبوں کا خرام
بھوکے بچوں کو کلیجے سے لگائے
آنکھوں آنکھوں میں چکاتے ہوئے دام
ہوتا رہتا ہے تقدس نیلام

کتنے شائستہ ہیں آئین حیات
کتنا محفوظ ہے انساں کا وقار
فکر پابستہ، نگاہیں محصور
کوئی اقرار نہ کوئی انکار
زندگی کیا ہے بجز لاشۂ دار

عارفِ دیں ہو کہ علامۂ دہر
جہل افروز، توہم بہ کمند
چیختے رہتے ہیں قسمت! قسمت!
مادرِ پاک کے بھولے فرزند
اور قسمت کہ تجوری میں ہے بند

اور اِس حال میں رہ کر بھی ہنوز
خندہ لب ہیں مرے جمہور تمام
زندگی صبر و قناعت بردوش
موت اِک عیشِ مسلسل کا پیام
زندہ باد اے مری تعمیرِ دوام

کیوں نہ خوش ہو مرا تابندہ ضمیر
کتنے جاں بخش ہیں یہ نظارے
دیکھتا ہوں تو اُمڈ آتے ہیں اشک
میری آنکھوں میں خوشی کے مارے

میرے محسن، مری جاں سے پیارے

تم تو ہر سال ہی آ جاتے ہو
آؤ، اِک اور عنایت کر جاؤ
کچھ نمک اور چھڑک دو اِن پر
بھر نہ جائیں مرے رِستے ہوئے گھاؤ
ضرب اِک اور لگاتے ہوئے جاؤ

مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔ فروری ۱۹۵۲ء

مزارِ قائد پر

ترے دیار کو ہم ظلمتوں کے ماروں نے
بڑے ہی پیار سے ارمان سے سنوارا تھا
قدم قدم پہ چھڑک کر جوانیوں کا لہو
ترے اُفق کو بڑے چاؤ سے نکھارا تھا
بچھا کے راہ میں کتنے ہی چاند تاروں کو
نئی سحر کے لیے راستہ اُبھارا تھا

خبر نہ تھی کہ سویرے کی رتھ پہ چڑھتے ہی
شعاعِ مہر، ستاروں کو بھول جائے گی
گلوں کی آنکھ بھر آئے گی مسکراتے ہی
صبا کی ساری تگ و دو فضول جائے گی

تھکا تھکا سا تبسم، اُڑا اُڑا سا رنگ
بہار، صحن چمن سے ملول جائے گی

یہ دھوپ چوس کے بیٹھی ہے جو شفق کا لہو
یہ کس وفا کا ہے انعام، سوچتا ہوں میں
اُبھر کے شرق سے مغرب کی سمت ہے جو رواں
اُس آفتاب کا انجام سوچتا ہوں میں
ترا خلوص، ترا پیار معتبر ہی سہی
ترا مآل بہ ہر گام سوچتا ہوں میں

ذرا نگاہ اُٹھا کر یہ زندگی تو دیکھ
ترا مزار، مزاروں کے بیچ ہے کہ نہیں
وہ گلستاں جسے ہم نے خزاں سے چھینا تھا
وہ آج اپنے ہی خاروں کے بیچ ہے کہ نہیں
بہ زعمِ اوجِ فلک لاکھ بے نیاز رہے
یہ آفتاب ستاروں کے بیچ ہے کہ نہیں

مہ و نجوم کی تابانیاں ہیں کم نہیں
مہ و نجوم کی تابانیوں کو موت نہیں
سکوتِ موج میں مضطر ہیں سینکڑوں طوفاں
تہہِ سکوت کی طغیانیوں کو موت نہیں
ہزار روندے ستاروں کو چلچلاتی دھوپ
تغیرات کی جولانیوں کو موت نہیں

○ نواب زادہ لیاقت علی خاں کا دورۂ امریکہ
○ مطبوعہ 'کارواں' کراچی۔ اگست، ۱۹۵۲ء

O

سورج سرِ جبینِ سحر چھوڑ آئے ہیں
تنہا سوادِ شب میں قمر چھوڑ آئے ہیں
اب کیا بتائیں تیری محبت میں جانِ من
کیا کیا متاعِ دیدۂ تر چھوڑ آئے ہیں

سوسائٹی گرل

تیری آزاد خرامی سے نہیں ہے شکوہ
تو نے اچھا ہی کیا، توڑ دی ہر قیدِ کہن
تیرے ملبوس کی خوشبو سے ہے پھولوں میں مہک
تیرے نقشِ کفِ پا سے ہے یہ ویرانہ، چمن

تیری زلفیں کہ بھری دھوپ میں پھیلی ہوئی چھاؤں
تیری پیشانی کہ جھیلوں پہ نہاتی ہوئی صبح
تیری آنکھیں کہ حسیں خواب دکھاتی راتیں
لب و رخسار کہ گلزار سجاتی ہوئی صبح

سنگِ مر مر سے تراشی ہوئی باہیں گویا
انگلیاں جیسے ہتھیلی میں کنول کھلتا ہوا
تیری پاپوش کہ چلتی ہوئی پھولوں کی قطار
تیری رفتار کہ اَٹھلاتی ہوئی موجِ صبا

وہ غرارہ کہ بچھی جاتی ہو قدموں میں سحر
وہ دوپٹہ کہ دھنک لوٹ رہی ہو جس پر

تیری سج دھج تری فطرت کا تقاضہ ہے مگر
تو ہے جس رہ پہ خراماں، وہ تری راہ نہیں
علم، احساس، شعور اور نظر کے باوصف
سر اُٹھایا نہیں کچھ اور جھکا دی ہے جبیں

جس چراغاں سے چکا چوند ہیں تیری آنکھیں
وہ چراغاں بجز اِک رقصِ شرر کچھ بھی نہیں
رونقِ نجم و قمر گھور اندھیرے تک ہے
شب گزر جائے تو یہ نجم و قمر کچھ بھی نہیں

تجھ کو احساس ہے اِس طرزِ روش کے باعث
ایک بازار ہوئی جاتی ہے محفل تیری
اپنے ماحول سے منہ پھیر کے جانے والی
نیپیر روڈ سے آگے نہیں منزل تیری

تو کہ جس طرح سرِ راہگزر کوئی سرائے
رات دلہن بنے اور صبح کو بیوہ ہو جائے

اشاعتِ اول بعنوان 'نازن' ماہنامہ 'شاہراہ' دہلی۔ نومبر ۱۹۵۲ء

O

کچھ فرق نہ آیا سحر و شام کے ہوتے
دن پھر نہ سکے گردشِ ایام کے ہوتے
ساغر ہے کہ ہم تک کبھی آتا ہی نہیں ہے
ساقی کی نگاہِ کرم عام کے ہوتے

۸/جنوری۵۳ء

(کراچی میں طلباء پر فائرنگ کا سانحہ)

ضعیف ماں! ترا فرزند، تیرا لختِ جگر
زمیں کی گود میں خاموش سو گیا ہے آج
جوان دل میں جواں حسرتوں کو دفنائے
وطن کی خاک کا پیوند ہو گیا ہے آج

کسے دکھاتی ہے تو اپنے دل کی ویرانی
چمن کا سوزِ دروں، گل فروش کیا جانے
یہاں تجارتِ گل ہے بہار کا مقصد
جو شاخِ گل پہ گزرتی ہے، وہ خدا جانے

بجھا بھی دے کہ یہ اشکوں کے ٹمٹماتے دیے
ترے کھنڈر میں چراغاں نہ کر سکیں گے کبھی

تری فغاں، ترے نالے فلک شگاف سہی
کسی خدا کو پشیماں نہ کر سکیں گے کبھی

ترا چٹان سا بیٹا زمیں میں گڑ تو گیا
ہوئی ہیں کتنوں کی عمریں دراز، یہ بھی تو دیکھ
ہر ایک قلب میں ہے سرنگوں بتِ 'محمود'
کہاں پہنچ گیا دستِ 'ایاز'، یہ بھی تو دیکھ

ضعیف ماں! یہ ہے انساں کا خوں، اِسے پی کر
یہ 'خواجگی' ۔ کبھی سر سبز ہو نہیں سکتی
ہزار دل کی سیاہی کو داغِ زہد چھپائے
لہو کے داغ عبادت بھی دھو نہیں سکتی

ہر اِک کتاب ہے انساں کے ذہن کی تخلیق
کتاب ذہن سے مستور رہ نہیں سکتی
کچھ اِس قدر ہے فزوں تشنگیِ علم کہ اب
کسی تجوری میں محصور رہ نہیں سکتی

ہم اپنے خوں سے جلائیں گے علم وفن کے چراغ
اور اِن چراغوں سے اِک کہکشاں بنا لیں گے
جہاں جہاں بھی بہا ہے لہو شہیدوں کا
وہیں وہیں پہ بنائے حیات ڈالیں گے

یہ قبر، قبر نہیں، مکتبِ شعور ہے یہ
یہیں پہ زیست کے نقشے سنورنے والے ہیں
یہ شمع، ہاں اِسی شمعِ مزار کی لو سے
ہزار ہا مہ و خورشید اُبھرنے والے ہیں

○ خواجہ ناظم الدین کی وزارت

O

اہلِ کارواں کو جب، ہو نہ فکرِ منزل تب، راہبر کو کیا کہیے
اپنی لغزشِ پا ہی، چاہتی ہے گمراہی، رہگزر کو کیا کہیے

دیوانی

(کراچی، ۸جنوری ۱۹۵۳ء۔ طلباء پر فائرنگ کے دوران ایک بوڑھی عورت زخمیوں کے درمیان سڑکوں پر دیوانہ وار قہقہے مارتی ہوئی 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگا رہی تھی۔ (ایک خبر)

خوشیاں مناؤ، رقص کرو، قہقہے لگاؤ
لوگو! خموش کیوں ہو، مرے ساتھ تم بھی گاؤ

گاؤ کہ آج بے خود و سرشار ہے حیات
گاؤ کہ آج رقص میں ہے ساری کائنات
گاؤ کہ آج رات ہے رشکِ شبِ برات
گاؤ کہ آج موت بھی ہے مژدۂ ثبات

گاؤ کہ آج رنگ پہ حسن بہار ہے
گاؤ کہ آج ارضِ وطن لالہ زار ہے

گاؤ کہ آج نغمہ بہ لب ہے سکوتِ نَے
گاؤ کہ آج وجد میں ہے زندگی کی لَے
گاؤ کہ ظرف جام سے باہر ہے موجِ مئے
گاؤ کہ ہو گئے ہیں کڑے کوس آج طے

دیکھا تھا میرے شاعرِ مشرق نے کل جو خواب
تعبیر سے وہ خواب ہوا آج فیض یاب

خلدِ وطن کی جھومتی گاتی ہواؤ آؤ
آؤ مری حسین فضاؤں کی اپسراؤ
دامن میں پھول بھر کے مرے لال پر لٹاؤ
دولہا بنا ہے آج مرا لال، تم بھی گاؤ

بندوقیں دے رہی ہیں سلامی اُٹھا کے ہات
اُٹھتی ہے میرے لال کی کس شان سے برات

کیا وقت ہے کہ آنکھ میں آنسو بھی آ گئے
نزدیک و دور، قوس قزح بن کے چھا گئے
کس آئنے میں چہرۂ فردا دکھا گئے
کن موتیوں کی آب زمیں پر لٹا گئے

ہر پاسبانِ علم کا، مکتب کا شکریہ
ذرّے سے تابہ شمس و قمر، سب کا شکریہ

کیا کیا نہ حسرتوں کے شکستہ ہوئے ایاغ
کتنے دیے بجھا کے جلایا تھا یہ چراغ
کن آنسوؤں سے دھوئے گئے ہیں جگر کے داغ
کس فصلِ گل نے آج کِھلایا ہے دل کا باغ

وا ماندہ رخشِ عمر کو آرام مل گیا
برسوں کے صبر و شکر کا انعام مل گیا

دو اپنے اِس دیارِ حسیں کو دعائیں دو
اِس نوبہارِ خلدِ زمیں کو دعائیں دو
سنگیں بکف، محافظِ دیں کو دعائیں دو
ہر ناخدائے عرش نشیں کو دعائیں دو

یہ جشن میرے لال کا جشنِ ثبات ہے
یہ نوشۂ عروسِ وطن کی برات ہے

ناچو، خوشی مناؤ، ہنسو، قہقہے لگاؤ
لوگو خموش کیوں ہو، مرے ساتھ تم بھی گاؤ

مطبوعہ 'پریت لڑی' امرتسر۔ مئی ۱۹۵۴ء

اجنبی مہمان

(امریکی وزیرِ خارجہ فوسٹر ڈلس کی آمد پر)

اِک نئے دوست آئے ہیں گھر میں
دوستو! کوئی اہتمام کرو
نفرتوں کے جلال کے باوصف
اپنے مہماں کا احترام کرو
بھیگی آنکھوں میں، خشک ہونٹوں پر
مسکراہٹ کا انتظام کرو
اپنی آزادیوں پہ ناز کرو
اپنی قبروں میں جشن عام کرو
کھل کے نعرے لگاؤ گام بہ گام
اور اونچا وطن کا نام کرو

یہ ہیں وہ صاحبِ خدا اوصاف
جن کے صدقے میں ملک پلتے ہیں
جن کی رحمانیت کی جنت میں
اختیاراتِ عرش چلتے ہیں
جن کی قہاریت کے دوزخ سے
آفتابوں کے دل دہلتے ہیں
جن کی ابرو کے اِک اشارے پر
انقلابات رُخ بدلتے ہیں
جن کے بت خانۂ سیاست میں
ناخدا کیا، خدا بھی ڈھلتے ہیں

یہ بہت دُور، دُور مغرب سے
ارضِ مشرق سجانے آئے ہیں
ایشیا کے اُمڈتے طوفاں سے
ایشیا کو بچانے آئے ہیں

تپتے جسموں کے پاؤں کے نیچے
چھاؤں اپنی بچھانے آئے ہیں
مصر کی طرح ارضِ پاک کو بھی
ایک ترکی بنانے آئے ہیں
اِک دکاں کی بساط اُلٹا کر
ایک دوکاں جمانے آئے ہیں

آج اپنے وطن میں اِن کے لیے
سج رہا ہے حیات کا بازار
دستِ گل چیں سے ہو رہا ہے پھر
صحنِ گلشن میں اہتمامِ بہار
ہر کمیں گاہِ ماہ و انجم سے
ہونے والی ہے صبح پر یلغار
اِک نیا کوریا ہے زیرِ وجود
ہو رہی ہے نئی زمیں ہموار

موت سے ہے غمِ حیات کا لطف
غم نہیں ہے تو ہر خوشی بیکار

کتنے خوش بخت ہیں یہ سکۂ زر
کتنا بد بخت ہے یہ اپنا دیار
کیسی سازش کو دے رہے ہیں پناہ
معبدوں کے بلند تر مینار
ماؤں کی گود میں بصد اخلاص
زندہ جسموں کے سج رہے ہیں مزار
ایک اِک گھر میں کوئی ہیر سیال
خونِ رانجھا سے کر رہی ہے سنگھار
شاہراہوں کے خشک کھیتوں میں
ابنِ آدم کی فصل ہے تیار

دوستو! کچھ تو بہر استقبال
اپنے مہمان پر نثار کرو
کچھ تو ہو گا تمہارے دل میں لہو
کچھ تو نذرِ جمال یار کرو
یہ شبِ وصل کٹ نہ جائے کہیں
اپنی بانہوں پہ اعتبار کرو
کوئی اقدام کوئی جرأتِ شوخ
کچھ تو اِس شب کو شرمسار کرو
کچھ تو ہو، دردِ عشق کی سوغات
کچھ تو اِس گلبدن کو پیار کرو

مطبوعہ 'مشرب' کراچی۔ جولائی، اگست ۱۹۵۳ء

مہاجر بستیاں

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم
مادرِ پاک کے خوابوں سے تراشے ہوئے جسم
عقل مجہول، نگہ کور، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم
ایک اِک دوش کہ پشتارۂ غم سے بوجھل
ایک اِک رگ کہ رمِ قطرۂ خوں سے محروم

ایک اِک دل میں دہکتے ہوئے دوزخ لاکھوں
اور آنکھیں کہ بسائے ہوئے خلدِ معدوم
کچھ نہیں فکر، بجز نانِ جویں، نانِ جویں
اور ہو گی بھی تو کیا حاجتِ قلبِ مرحوم
شام ہوتی ہے تو پھر صبح کی بھوکی قبریں
چاٹ جاتی ہیں ہر اِک سایہ و ہر نقشِ قدوم

عمر تا عمر اِسی طرح سے کٹ جاتی ہے
اپنی آنکھوں میں لیے گم شدہ منزل کی تلاش
اپنی پلکوں پہ اُٹھائے ہوئے 'اِک خواب' کی لاش
زندگی موت کی گودی میں سمٹ جاتی ہے

یہ نظم 'ابن مریم' کے نام سے ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ 'افکار' میں شائع ہوئی تھی۔ (شاعر)

O

اشجار دھوپ میں ہیں مسلسل کھڑے ہوئے
کیسے اُٹھائیں پاؤں، زمیں میں گڑے ہوئے

دلاسہ

(اپنے پھوپی زاد بھائی قاضی شفیع کے نام)

نہ رو میرے بھائی کہ دنیا یہی ہے

یہ دنیا جہاں عرصۂ زندگی بھی
ہمارے لیے موت سے کم نہیں ہے
ہر اِک پل میں اِک عمر کا طول پنہاں
یہاں پر تو اِک پل بھی ہمدم نہیں ہے
کلی کی چٹک سے گلوں کی پھبن تک
کوئی لمحۂ زیست محکم نہیں ہے
سحر کا تبسم ہو یا شب کی سج دھج
کہاں وقت کی آنکھ پرنم نہیں ہے

تم اپنی یتیمی پر نوحہ کناں ہو
مگر اِس فغانِ مسلسل سے حاصل
یہ وہ غم ہے جس کا مداوا نہیں ہے
یہ وہ بحر ہے جس میں طوفاں نہ ساحل
یہ وہ دشت ہے جس میں سبزہ نہ چھاؤں
یہ وہ آگ ہے جو ہے خود شمعِ محفل
کہاں تک تم اِس آگ میں جل سکو گے
کہ ہیں اشک ہی ہر تبسم کی منزل

میں یہ جانتا ہوں کہ اِس غم کا باعث
تقاضائے عمر طبیعی نہیں ہے
یہ غم، ہر غمِ زندگی کا ہے عنواں
یہ داغ اپنی دنیا کا داغِ جبیں ہے
یہ مرقد ہے اِس نظمِ دوراں کا محور
اِسی قبر میں اپنی دنیا ہے، دیں ہے
یہ آنسو ہے اپنا ہی خونِ بصیرت
اور اِس خوں میں تر اپنی ہی آستیں ہے

مرے دوست اِس اشک پرور جہاں میں
ہمیں ہنس کے ہر اشک پینا پڑے گا
بہ ہر گام دامانِ دل چاک ہو گا
بہ ہر طور، ہر چاک سینا پڑے گا
بہ ہر جام، زہرِ ہلاہل ملے گا
مگر ہم کو ہر جام پینا پڑے گا
بدل جائے جب تک نہ یہ نظمِ گیتی
ہمیں موت کی زد میں جینا پڑے گا

(۱۹۵۴ء)

(۱۵/دسمبر ۱۹۷۶ء کو قاضی شفیع کا بھی انتقال ہو گیا)

سکوتِ مضطرب

(اپنے عزیز دوست لطیف ساجد کے انتقال پر)

ہم نشیں تیری جدائی سے جو دل پر گزری
کاش میں اُس کو کسی طرح بیاں کر سکتا
کاش وہ غم کہ جو شرمندۂ مژگاں نہ ہوا
اپنے اشعار میں اُس غم کو عیاں کر سکتا
کوئی اسلوب، کوئی لفظ سہارا دیتا
کسی عنوان، کسی طور، فغاں کر سکتا

دل میں اِک حشر سا برپا ہے کہ خاموش بھی ہے
ایک طوفاں ہے کہ ساکت بھی ہے پرجوش بھی ہے

زہرخند

(اُن نام نہاد 'ثقہ' ادیبوں کے نام جو منٹو کی موت کی خبر سن کر قہقہے لگا رہے تھے)

خوش ہو اے ارضِ بے ضمیر کہ آج
تیرا اِک بارِ دوش اُتر ہی گیا
تیرے فیضِ کرم سے آخرِ کار
ایک زندہ ادیب مر ہی گیا

خوش ہو اب تیرے غم گساروں کے
جیب و دامن نہ ہو سکیں گے چاک
وہ قلم تو نے آج توڑ دیا
جس نے کھولے حیات کے پیچاک

خوش ہو اب تیرے غازۂ رخ کی
کوئی اِک تہہ نہیں اُتارے گا
تیرے بازار کا گرے گا نہ بھاؤ
یوں کوئی نقدِ جاں نہ ہارے گا

خوش ہو، یہ موت تیری محفل میں
زندگی کا پیام لائی ہے
چند لمحوں کے واسطے ہی سہی
قہقہے کا مقام لائی ہے

آج جی بھر کے دورِ جام چلے
کاگ اُڑتے رہیں سروں کی طرح
مرتا جائے گا یوں ہی ہر فن کار
تیری پچھلی روایتوں کی طرح

○ یہ نظم فروری ۱۹۵۵ء میں 'ابن مریم' کے نام سے 'افکار' کراچی میں شائع ہوئی تھی۔ (شاعر)

ایک سرکش دماغ تھا۔۔۔نہ رہا

(سعادت حسن منٹو کی موت پر ایک اور نظم)

کیا کچھ نہ دل پہ بیت گئی ہے نہ پوچھیے
جب یہ کہا کسی نے کہ منٹو گزر گیا
یوں دل دھڑک کے ہو گیا خاموش یک بہ یک
جیسے خود اپنے گھر کا کوئی فرد مر گیا

اُس پر سکوت لمحۂ سوزاں سے آج تک
جب بھی قلم اُٹھایا ہے آنسو نکل گئے
اُس کا خیال آتے ہی یوں چیخ اُٹھی ہے روح
گویا دل و دماغ پہ آرے سے چل گئے

احساس پہلے کم تھے دلِ غم پناہ پر
جو ہم نئے کرم سے نوازے گئے ہیں آج
کس کو خبر اِس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی، کتنے جنازے گئے ہیں آج

یہ دور جس میں دل کا نہیں ہے کوئی مقام
پتھر سے کر رہا ہے جو شیشے کا احترام
اِس دور میں بہ جرأتِ رندانہ دل کی بات
کہتا رہا ہے کوئی تو منٹو تھا اُس کا نام

منٹو کہ جس نے زہر پیا ہے بہ ہر نفس
اور زندگی کا نام لیا ہے تمام عمر
تہذیب کا کھرچ کے ہر اِک غازۂ فریب
انساں کا انتقام لیا ہے تمام عمر

وہ زندگی اسیرِ جہاں کب رہی کہ آج
قیدِ نفس سے بھی اُسے آزاد کر دیا

کس وقت آ گیا ہے تری رحمتوں کا جوش
یہ تو نے آج کیا میرے صیاد کر دیا

یہ محفلِ ادب کہ بہ قحطِ چراغِ فکر
اِک عرصۂ دراز سے ظلمت بدوش ہے
اِک طاق پر کہیں بہ تپِ شعلۂ دروں
'اِک شمع جل رہی تھی سو وہ بھی خموش ہے'
(۱۹۵۵ء)

O

ناقدریءِ فن کا، مرے فن کار گلہ کیا
آئینے کی قسمت میں ہے، پتھر کے سوا کیا

بازار میں آئے ہیں تو بولی بھی اُٹھے گی
فن جنس ہی ٹھہرا ہے تو گاہک کی خطا کیا

انسان امر ہے

(ایتھل اور جولیس روزن برگ کی موت پر)

نئے جہاں کے نئے خداؤ
تمہیں بھی نیچا دکھا کے آخر
یہ نیچ انساں اُبھر گیا ہے

جو خوں کہ تم دفن کر چکے ہو
وہ خوں نشیبوں میں تہہ نہ پا کر
اُفق اُفق تک بکھر گیا ہے

ذرا نگاہیں اُٹھا کے دیکھو
چمن چمن سے قفس قفس تک
یہ شعلے کیسے بھڑک رہے ہیں

تباہ تو ایک گھر ہوا ہے
مگر اِس اِک گھر کے غم میں تپ کر
تمام عالم بپھر گیا ہے

کہاں وہ رابرٹ و مائیکل کے
پلک پلک سے ٹپکتے آنسو
کہاں یہ مشرق کا چاک دامن

ہزار ہا دوریاں ہیں لیکن
یہ خون ہر موڑ سے گزر کر
ہر ایک دل میں اُتر گیا ہے

نہ جانے اِس خوں میں کیا نہاں ہے
نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن
نہ جانے کتنی شبوں کی صبحیں

کہ آج اِس خون میں نہا کر
حیات کا حسن اور بھی کچھ
نکھر گیا ہے سنور گیا ہے

نئے جہاں کے نئے خداؤ
نہ جانے اِن پستیوں کی تہہ میں
بلندیاں کس قدر نہاں ہیں

کہ کل ہی تم ایک ہیروشیما
زمین میں دفن کر کے اُٹھّے
اور آج اِک چین اُبھر گیا ہے

O

نئے جہاں کے نئے خداؤ
تمہارے مدفن ہی بن نہ جائیں
تمہارے اپنے قفس ہزاروں

تمہارا یہ عرشِ زر سلامت
کہ اب تمہاری ہی جنتوں میں
نہاں ہیں آتش نفس ہزاروں

تمہیں یقیں آئے یا نہ آئے
زمیں چٹانوں کے ناز سہہ کر
نشیب کے غم کو پا گئی ہے

فرازِ دار و رسن کی تہہ میں
جمے ہوئے خوں سے جھانکتے ہیں
تمہارے بیتے برس ہزاروں

تمہارا ہر اِک طلسمِ رنگیں
خود اپنے ہی جال میں اُلجھ کر
بہ ہر قدم ٹوٹتا چلا ہے

حقیقتوں کے حضور ہر سو
سروں کے بل گرتے جا رہے ہیں
عظیم تر 'ما لتھس' ہزاروں

مجھے خبر ہے تم آج ہر سو
حقیر انساں کے نقشِ پا سے
زمین کو پاک کر رہے ہو

مگر ذرا اِس طرف بھی دیکھو
یہ کونپلیں سر اُٹھا رہی ہیں
کہ بکھرے خاشاک و خس ہزاروں

نئے جہاں کے نئے خداؤ
محبتوں کو فنا نہیں ہے
صداقتیں مٹ نہیں سکیں گی

ہزار تم اِن کا خوں نچوڑو
ہر ایک گھر میں ہے ایک 'ایتھل'
سڑک سڑک 'جولیس' ہزاروں

o مالتھس کا نظریہ آبادی جنگ کو ایک حیاتیاتی ضرورت بناتا ہے (شاعر)

O

رہِ طلب میں ہے دار و رسن بھی اِک منزل
وگرنہ موت کا ہوتا ہے کون شیدائی

منظر و پس منظر

چلتے چلتے ٹھٹک گئے دو پاؤں
اِک دکاں پر نگاہ جم سی گئی
خشک آنکھوں میں برق سی تڑپی
دل کی دھڑکن مچل کے تھم سی گئی

رنگ رنگ آبدار ملبوسات
جیسے نظروں کے سامنے منشور
تہہ بہ تہہ آئینوں میں قوس قزح
کتنی نزدیک اور کتنی دور

ساریاں جیسے سطحِ آبِ رواں
ساریاں جیسے کہکشاں لہرائے
ساریاں جیسے چاندنی لبِ جو
ساریاں جیسے گلستاں لہرائے

چھوٹے چھوٹے سے شیش محلوں میں
حسنِ فطرت، جمالِ فن محدود
یہ تجارت، یہ ارتقا کا کمال
کائنات اِک دکاں پہ سر بہ سجود

ایک شوکیس میں بنارس قید
ایک شوکیس محبسِ کشمیر
ایک شوکیس، اِک حسیں زنداں
برّاعظم سے تا بہ برِصغیر

اُس کی ظلمت زدہ نگاہوں میں
ان حقائق کی اِک کرن بھی نہ تھی
جانے کیا سوچتی رہی وہ غریب
اُس کے ماتھے پہ اِک شکن بھی نہ تھی

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
جگمگاتے ہوئے جہان پرائے
آرزؤں کے رنگ محلوں میں
اجنبی جنتوں کے خواب سجائے

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
خشک آنکھوں میں سیلِ اشک چھپائے
ہڈیوں کے نحیف سینے میں
دل کی بے نام خواہشات دبائے

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
زندگی کی عجیب تصویریں
اِس اُجالے میں ڈھونڈتی ہی رہی
اپنے خوابوں کی شوخ تعبیریں

یک بہ یک ایک کار آ کے رکی
یک بہ یک ایک برق سی لہرائی
یک بہ یک تن گئی فضا میں دھنک
ایک عورت دکاں کے اندر آئی

ایک عورت کہ یاسمین کی بیل
ایک عورت کہ چلتی پھرتی برق
ایک عورت کہ چاندنی میں تاج
ایک عورت کہ اپنی آب میں غرق

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
جگمگاتی دکاں سے کار تلک
کتنی یکساں تھی، کتنی ہم آہنگ
قہقہوں اور روپیوں کی کھنک

خشک آنکھوں میں بجلیاں پیہم
ناچتی، کوندتی، لپکتی رہیں
کار میں قہقہے سمٹ بھی گئے
خشک آنکھیں پلک جھپکتی رہیں

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
زندگی کے نشیب اور فراز

قصرِ 'محمود' سے ہے کتنی دور
گرد آلود رہگزارِ 'ایاز'

وہ خدیجہ ہو یا کہ سیتا ہو
کوئی کعبہ ہو یا صنم خانہ
آرزوؤں ہی سے عبارت ہے
زندگی کا حسین افسانہ

گرد آلود پاؤں اُٹھنے لگے
دل میں طوفانِ حشر خیز دبائے
آرزوؤں کے کانپتے تابوت
تھرتھراتی پلک پلک پہ اُٹھائے

وہ چلی تو گئی مگر چپ چاپ
نظمِ دوراں کا وزن تول گئی
کتنی اوجھل حقیقتوں کا پول
اہلِ فکر و نظر پہ کھول گئی

مطبوعہ ہفتہ وار 'آئینہ' دہلی۔ ۱۳ جون ۱۹۵۵ء

طبقاتی مساوات

(فلسفۂ عینیت کی روشنی میں)

یہ محض حادثات ہیں
کہ آج الگ الگ ہیں ہم
وگرنہ دل، بہ فیضِ غم
ازل سے ساتھ ساتھ ہیں

تمہارے اور ہمارے غم
الگ نہیں، جدا نہیں
جہاں کے دو خدا نہیں
وہ مہر ہے، ستارے ہم

ہماری محفلِ حسیں
اُسی کی جلوہ گاہ ہے
یہ سب اُسی کی چاہ ہے
کوئی کہیں، کوئی کہیں

یہ دل کی رسم و راہ ہے
یہ عشق کے ہیں سلسلے
یہ قربتیں، یہ فاصلے
'عنایتِ نگاہ' ہے

غلط شکایتیں، گِلے
جو پاس ہے تو چاند ہے
جو دور ہے وہ ماند ہے
کہ فاصلے ہیں فاصلے

مگر یہ بات بھی ہے طے
جو ہم 'قریبِ ذات' ہیں

تو کتنے باثبات ہیں
حیات پھر حیات ہے

یہ محض حادثات ہیں
کہ آج الگ الگ ہیں ہم
وگرنہ دل، بہ فیضِ غم
ازل سے ساتھ ساتھ ہیں

(۱۹۵۵ء)

O

اک ذرہ جرأتِ پرواز کہ آج
سو گئے تھک کے نگہبانِ قفس

O

کیا ظلم ہے ہر کوشش پرواز پہ صیاد
ہنس پڑتا ہے اور داد دیے جاتا ہے مجھ کو

رموزِ حیات

کتنے نادان ہیں مرے جمہور
اپنی سرکار سے اُلجھتے ہیں
جانتے بوجھتے رموزِ حیات
زہر کو انگبیں سمجھتے ہیں

اِس دو روزہ حیات میں آخر
خوابِ عیشِ دوام سے حاصل
موت کے بعد، زندگی ہی ہے
راستے کے قیام سے حاصل

کیسے سمجھاؤں یہ نکاتِ دوراں
مفلسی بھی خدا کی نعمت ہے

اِس جہاں میں جو دکھ اُٹھاتے ہیں
اُس جہاں میں انہیں کی جنت ہے

اور وہ لوگ جن کو دنیا میں
ساری عیاشیاں ہیں آج نصیب
جلتے بھنتے رہیں گے دوزخ میں
اُس 'حیاتِ مدام' میں وہ غریب

کس قدر ہے عظیم یہ ایثار
'خوابِ عیشِ دوام' کی خاطر
خود اُٹھائیں گے مستقل تکلیف
صرف اپنے عوام کی خاطر

کتنے نادان ہیں مرے جمہور
زہر کو انگبیں سمجھتے ہیں
جانتے بوجھتے رموزِ حیات
اپنی سرکار سے اُلجھتے ہیں

مطبوعہ 'مشرب' کراچی۔ستمبر ۱۹۵۳ء

کافی ہاؤس

سبھی 'عظیم' یہاں ہیں، سبھی ہیں دانشور
یہاں، مرے دلِ ناداں، کہاں ہے تیرا گزر
یہ وہ مقام ہے جس جا عوام کے فنکار
غمِ عوام میں دن رات ایک کرتے ہیں
یہیں تو آتے ہیں زیرِ وجود وہ شہکار
کہ جن کے حسن پہ ہم دل فگار مرتے ہیں
یہ پیالیاں ہیں کہ جامِ جہاں نما، مت پوچھ
انہی کی تہ سے یہ 'افکارِ نو' اُبھرتے ہیں

جو ایک گھونٹ اُترتا ہے حلق سے نیچے
تو ذہن، عرش کے اسرار فاش کرتے ہیں
یہ سگرٹوں کے دھوئیں، حلقہ ہائے دام خیال
یہ ایک کش میں کہاں سے کہاں گزرتے ہیں
وہ کوریا ہو کہ وتنام ہو کہ زلفِ حبیب
تمام گیسوئے برہم یہیں سنورتے ہیں
جو اِس فضا میں ہو باہم سخن کی فرمائش
تو جبرئیل کے مانند شعر اُترتے ہیں
یہاں، مرے دلِ ناداں، کہاں ہے تیرا گزر
سبھی عظیم یہاں ہیں، سبھی ہیں دانشور

(۱۹۵۵ء)

لاشوں کی بستی

صبر کر اے دل کہ اِس دنیا میں کیا کیا غم نہیں
اور پھر یہ سرزمیں، اِس کے بھی احساں کم نہیں

ہر نفس اِک داستانِ غم ہے، لب چپ ہیں تو کیا
کوئی آنکھ ایسی ہے جس میں خندۂ پرنم نہیں

کٹ رہی ہے ہر رگِ جاں ٹوٹتی جاتی ہے سانس
چیخ ہی اُٹھیں کم از کم، اِس قدر بھی دم نہیں

اِک سکوتِ مضمحل ہے ذرے ذرے پر محیط
وقت کے دھارے میں لیکن کوئی زیر و بم نہیں

زندگانی اِک مسلسل موت ہو کر رہ گئی
اِس قدر خاموش ہیں سب جیسے کوئی غم نہیں

O

موت سے کس کو مفر ہے موت کا ماتم نہیں
غم تو یہ ہے اِس زمیں پر زندگی کا غم نہیں

ایک دوکاں میں سمٹ کر رہ گئی ہے کائنات
جُز تجارت، قدر کوئی زیست کی محکم نہیں

کیسے کیسے لوگ دنیا سے چلے منہ موڑ کر
اور دنیا کا یہ عالم، فرصتِ ماتم نہیں

کوئی منٹو چل بسے، حسرت٭ بچھڑ جائے کوئی
لیلیٰء شام و سحر کی زلف تک برہم نہیں

اِس فضا میں کوئی کیا نغمے بکھیرے، خوں جلائے
جس فضا میں حرفِ غم کا کوئی بھی محرم نہیں

(۱۹۵۵ء)

٭چراغ حسن حسرت

مادرِ وطن کا نوحہ

میرے بدن پر بیٹھے ہوئے گِدھ
میرے گوشت کی بوٹی بوٹی نوچ رہے ہیں
میری آنکھیں۔۔۔میرے حسیں خوابوں کے نشیمن
میری زباں۔۔۔موتی جیسے الفاظ کا درپن
میرے بازو۔۔۔خوابوں کی تعبیر کے ضامن
میرا دل۔۔۔جس میں ہر ناممکن بھی ممکن
میری روح، یہ سارا منظر دیکھ رہی ہے
سوچ رہی ہے
کیا یہ سارا کھیل تماشا
(خونخواروں کے دسترخواں پر میرا لاشہ)
لذت کام و دہن کے لیے تھا؟

(۱۹۵۸ء)

ایک مصرعہ۔۔۔ایک نظم

(عوام)

رات سورج کو نگل سکتی ہے، تاروں کو نہیں

(دوشیزگی)

نہ مسکرائے تو گلزار، مسکرائے تو پھول

(مستقبل)

رات کی گود میں سویا ہوا مہتاب کا خواب

مطبوعہ 'ادب لطیف' لاہور۔ فروری ۱۹۵۲ء

رعبایات

ہر نقش سے اِک خواب مجسّم اُبھرا
ہر ذرّے سے اِک ساختہ عالم اُبھرا
قدرت کی حقیقت کا ملا جب بھی سراغ
ہر عکس سے عکسِ رخِ آدم اُبھرا

ہر قلب کی رگ رگ کو نچوڑا برسوں
جو ظلم بھی تھا بس میں نہ چھوڑا برسوں
فطرت نے خود انسان کی عظمت کے لیے
انسان کی غیرت کو جھنجھوڑا برسوں

لب سی دیے ہلکے سے تبسّم کے عوض
دم کھینچ لیا ایک ترنّم کے عوض
کیا دوست ہمارا ہے کہ جس نے بہ خلوص
خوں چوس لیا دانۂ گندم کے عوض

ہر راہ پُرآلام، نہ جانے کیا ہو
ہر موڑ پہ کہرام، نہ جانے کیا ہو
جس دور کا ہے موت ہی عنوان حیات
اُس دور کا انجام، نہ جانے کیا ہو

ہر راز کا ہے آج جگر شق ہم سے
فطرت کا بہ ہر گام ہے منہ فق ہم سے
کھینچا گیا منصور سرِدار تو کیا
زندہ ہیں روایاتِ اَناالحق ہم سے

فطرت کے تلّون کو نہ کھونے دیجے
میں روتا ہوں، چلیے مجھے رونے دیجے
لیکن مرے سرکار بنامِ تقدیر
انسان کو حیوان نہ ہونے دیجے

ادھوری غزلیں

کس کے لہو سے نکھرے ہیں چہرے گلاب سے
تیوری پہ بل نہ آئیں تو پوچھوں جناب سے

کتنی ہے دل نواز، ادائے گریز بھی
کچھ اور بڑھ گئی ہے طلب اجتناب سے

چلمن گری جو در پہ تو ہر پردہ اُٹھ گیا
کیا کیا کھلے ہیں راز، ترے اِس حجاب سے

O

کٹ گئی رات، رات باقی ہے
گفتنی ہے جو بات، باقی ہے

نفرت کی حدیں پاٹ رہی ہے کب سے
خود اپنا لہو چاٹ رہی ہے کب سے
اِک شخص کی ناعاقبت اندیشی کی
اِک قوم، سزا کاٹ رہی ہے کب سے

نظروں سے ہوئے دور، نظر میں آ کر
منزل ہوئی معلوم، سفر میں آ کر
تاریخ میں ہو گا کوئی ہم سا خوش بخت
بے گھر ہوئے ہم اپنے ہی گھر میں آ کر

مطبوعہ ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد دکن۔ جون ۱۹۵۵ء

رشتۂ روشنی بہ فیضِ طلب
سائے سائے کے ساتھ باقی ہے

کعبۂ دل میں آج بھی شاعر
نقشِ لات و منات باقی ہے

O

خزاں میں لوگ کہتے تھے بہار آئے بہار آئے
بہار آئی تو جانے کیوں چمن سے اشک بار آئے

وہ محفل ہے نظر میں اور اتنا یاد ہے ہم کو
گئے تھے پُرسکوں لیکن بہت ہی بے قرار آئے

وفورِ ظلمتِ شب تھا تو کتنے نام تھے اُن کے
مگر یہ ماہ انجم جب شبِ ظلمت گزار آئے!

نمکین غزلیں

قصے بہت رقم تھے ثواب و عذاب کے
جب غور سے پڑھا تو ملے نقش آب سے

سر پر محیط ازل سے ہیں جو سات آسماں
اِس دور میں کھلا کہ ہیں گنبد حباب سے

O

کیا احترامِ علم ہے پڑھتے ہوئے کبھی
اوراق بھی کٹے نہ پرانی کتاب کے

سب کو دکھا چکے ہیں، ہتھیلی میں سبز باغ
یونہی نہیں ہیں لوگ مرید آں جناب کے

O

کیا ضروری ہے کہ ہر بات کو ہم شعر کریں
بات کہنے کی نہ ہو، پھر بھی رقم شعر کریں

مصرعۂ طرح کا فرمائیں وظیفہ ہر دم
پھر مریضانِ غمِ عشق پہ دم شعر کریں

اپنی حالت پہ لہو رونے لگی عقل سلیم
اب تو اپنی ہمدانی ہی کا غم شعر کریں

جن کے نزدیک ہے بس قافیہ پیمائی غزل
اپنی غزلوں سے بھلا کیسے وہ کم شعر کریں

O

جب سے بنا ہوا ہے میرا یار مولوی
سر پر سوار رہتے ہیں دو چار مولوی

موسم تو آئے، پھر اُسے منبر پہ دیکھنا
کیا گل کھلائے گا یہ طرح دار مولوی

وہ وقت بھی عذابِ الٰہی سے کم نہیں
جب آدمی میں ہوتا ہے بیدار مولوی

O

اب کیا اُسے کہیں کہ وہ ناداں بھی ہے بہت
انسان ہو نہ ہو پہ مسلماں بھی ہے بہت

حمایت علی شاعر کی کتابیں

شاعری

1۔ آگ میں پھول (نظمیں،غزلیں، رباعیات)

2۔ مٹی کا قرض (ثلاثیاں، نظمیں،غزلیں)

3۔ تشنگی کا سفر (طویل افسانوی اور تمثیلی نظمیں اور غنائیے)

4۔ ہارون کی آواز (نظمیں،غزلیں اور ایک طویل نظم)

5۔ آئینہ در آئینہ (منظوم خودنوشت سوانح حیات)

6۔ حرف حرف روشنی (منتخب کلام)

7۔ عقیدت کا سفر (سات سو سال کی نعتیہ شاعری کا انتخاب)

8۔ تجھ کو معلوم نہیں (منتخب فلمی نغمات)

9۔ چاند کی دھوپ (تازہ کلام)

تراجم

بنگال سے کوریا تک (طویل افسانوی نظم)

1. *Flower in Flames* By Prof: Rajinder Singh Verma
(Panjabi University Patyala. India)

2. *Flute and Bugle* By Parkash Chander
(Editor. "Times of India" Delhi)

3۔(ہندی) ترجمہ نگار: پروفیسر جی این نداف (مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد)

4۔(سندھی) گل باہ مہ۔ ترجمہ نگار: ایم ای عالمانی (حیدر آباد، سندھ)

حرف حرف روشنی (طویل نظم اور منتخب کلام)

1.*Every Word Aglow* By Prof: Rajinder Singh Verma

2۔حرف حرف روشنی (ہندی) ترجمہ نگار: بھگ تل (مہاراشٹر) Mr. C.Gaius Bhatul

O

شاعر نظامِ زر کا ہے پروردہ ذوقِ حسن
گہیوں سے بھی حسین ہیں سونے کی بالیاں

O

ہم کہ اردو زباں کے شاعر ہیں
ہم سے مت پوچھئے کہ ہم کیا ہیں
ہم زمیں پر ہیں آسماں کی طرح
یوں کہیں بھی نہیں، پہ ہر جا ہیں

3۔ شبد شبد پرکاش (ہندی) ترجمہ نگار: قاضی رئیس (مہاراشٹر)

نثری کتب

1۔ شیخ ایاز (سندھی کے جدید عہد آفریں شاعر کا مطالعہ)

2۔ شخص و عکس (مقالات، تبصرے اور مباحث)

3۔ کھلتے کنول سے لوگ (حیدرآباد دکن کے اہلِ قلم)

4۔ حمایت علی شاعر کے ڈرامے (ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے)

تراجم

1۔ حمایت علی شاعر جاڑ راما (رشید احمد لاشاری، ایم بی انصاری، ممتاز مرزا، محمد اسحاق پیر سرہندی)

اختلافی مباحث

1۔ کسی چمن میں رہو تم (مرتب، قاصد عزیز اور نعمت اللہ)

2۔ احوالِ واقعی (مرتب، پروفیسر مرزا سلیم بیگ)

3۔ بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک (مرتب، رعنا اقبال)

4۔ تثلیث یا ثلاثی (مرتب، رعنا اقبال)

حمایت علی شاعر... فن و شخصیت (مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

مقالہ نگار: رعنا اقبال (ڈپٹی ڈائریکٹر ریسرچ وانفارمیشن، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی)

منتظرِ اشاعت

1۔ نقطۂ نظر (تحقیقی اور تجزیاتی مضامین)

2۔ مہران موج (سندھ کی عوامی کہانیوں کا تمثیلی روپ)

3۔ چنگاریاں (اردو شاعرات کا مطالعہ)

4۔ نئی پود (نئی نسل کے اہلِ قلم)